ماہنامہ حکمتِ قرآن لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدام القرآن - لاہور

تصانیف ڈاکٹر اسرار احمد

1	مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق	4.00
2	راہِ نجات (سورۃ العصر کی روشنی میں)	5.00
3	قرآنِ حکیم کی سورتوں کا اجمالی تجزیہ	10.00
4	مطالعۂ قرآنِ حکیم کا منتخب نصاب	12.00
5	قرآن اور امنِ عالم	2.00
6	رسولِ کامل ﷺ	6.00
7	نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت	4.00
8	نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں	3.00
9	معراج النبی ﷺ	3.00
10	شہیدِ مظلوم (حضرت عثمان ذوالنورینؓ)	4.00
11	سانحۂ کربلا (شہادتِ حسینؓ کا اصل پس منظر)	3.00
12	اسلام کی نشاۃِ ثانیہ: کرنے کا اصل کام	2.00
13	اسلام میں عورت کا مقام	10.00
14	عظمتِ صوم	2.00
15	عید الاضحیٰ اور فلسفہ قربانی	3.00
16	اسلام اور پاکستان	5.00
17	علامہ اقبال اور ہم	2.00

تراجم

1	ماذا یجب علی المسلمین تجاہ القرآن	(قرآن مجید کے حقوق کا عربی ترجمہ)	5.00
2	حقوق قرآن بر مسلمان	(" " " فارسی ترجمہ)	
3	The Obligations Muslims owe to the Quran.	(انگریزی ترجمہ)	5.00
4	The way to Salvation—in the light of Surah Al-Asr.	("راہِ نجات" " ")	5.00
5	The Quran & World Peace.	("قرآن اور امنِ عالم" " ")	4.00
6	Islamic Renaissance The Real Task Ahead.	("اسلام کی نشاۃِ ثانیہ" " ")	4.00
7	Rise & Decline of Muslim Ummah.	("سرافگندیم" کا ایک باب " ")	5.00

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ ۲۶۹)

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

جاری کردہ: ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر اسرار احمد ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی،

معاون مدیر: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

جلد ۳	فروری ۱۹۸۵ء مطابق جمادی الاولیٰ ۱۴۰۵ھ	شمارہ ۱۲

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶-کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۱۴

فون: ۸۵۳۶۱۱

مضمون نگار حضرات کی آراء سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

فہرس

☆ حرف اوّل ———————— ۳
ڈاکٹر ابصار احمد

☆ الٓـمّٓـرٰ (سورہ ہود) ———————— ۵
ڈاکٹر اسرار احمد

☆ ایمان اور اس کے ثمرات و مضمرات ———————— ۱۳
ڈاکٹر اسرار احمد
سورہ تغابن کی روشنی میں قسط ۲

☆ فکر مغرب کی اساس — اور
اس کا تاریخی پس منظر ———————— ۲۴
پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم

☆ حضرت عبداللہ بن مسعود —
جماعت صحابہ کی ایک جلیل المرتبت شخصیت ———————— ۴۲
مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

☆ قرآنی علم و فہم کا درجہ حکمت (۱۳) ———————— ۵۴
مولانا محمد تقی امینی

☆ مضاربت کی حقیقت اور شرعی حیثیت (۴) ———————— ۶۱
مولانا محمد طاسین

افکار و آراء ———————— ۷۱

سالانہ زر تعاون : ۳۰ روپے ——— فی شمارہ : ۳ روپے
——— مطبع : آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ، لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

ماہِ فروری کا حکمتِ قرآن پیشِ خدمت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے کہ اب یہ ماہنامہ کتابت و طباعت کے جملہ مراحل طے کر کے بروقت قارئین کی خدمت میں پہنچ جاتا ہے۔ ان شاء اللہ یہ باقاعدگی اب جاری رہے گی ——— زیرِ نظر شمارے میں 'فکرِ مغرب کی اساس اور اس کا تاریخی پس منظر' کے عنوان سے پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم کا ایک مقالہ شامل ہے۔ یہ مقالہ یا مضمون چشتی صاحب مرحوم نے ایک خط کی شکل میں برادرِ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو ان کے اس مضمون کی تحسین و تائید کے طور پر لکھا تھا جو 'اسلام کی نشأۃِ ثانیہ: کرنے کا اصل کام' کے عنوان سے 'میثاق' میں شائع ہوا تھا۔ چشتی صاحب مرحوم کے اس وقیع مضمون کے ساتھ منسلکہ تعارفی نوٹ یقیناً قارئین کی دلچسپی کا باعث ہوگا ——— حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مقام و مرتبہ کسی بھی دینی ذوق رکھنے والے شخص سے مخفی نہیں خصوصاً فقہی مسائل میں وہ تمام صحابہ میں ایک ممتاز مقام رکھتے تھے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جلیل المرتبت شخصیت پر مولانا سعید الرحمٰن علوی صاحب کا ایک تحقیقی مقالہ اس شمارے میں شامل ہے۔ مولانا علوی صاحب کے اس مضمون سے حضرت ابنِ مسعودؓ کی بلند پایہ شخصیت کے کئے اور گوشے بھی سامنے آتے ہیں۔ خاص طور پر تفسیرِ قرآن کے ضمن میں انؓ کا جو مقام تھا اسے علوی صاحب نے وضاحت سے بیان کیا ہے ——— مولانا محمد طاسین صاحب کے محققانہ مضمون 'مضاربت کی حقیقت اور شرعی حیثیت' کی چوتھی قسط شاملِ اشاعت ہے۔ اس سلسلے کی مزید ایک قسط ابھی باقی ہے جو ان شاء اللہ آئندہ شمارے میں پیشِ قارئین کی جائے گی۔

ابصار احمد

قارئین "ماہنامہ میثاق" اور "ماہنامہ حکمتِ قرآن" متوجہ ہوں!

تحریک تجدید ایمان ۔ توبہ ۔ تجدید عہد اور دعوت رجوع الی القرآن کے یہ دونوں نقیب و ترجمان پاکستان میں حسب ذیل پتوں سے مل سکتے ہیں۔ نیز جدید سالانہ خریداری کے اجراء یا قدیم سالانہ خریداری کی تجدید کے لئے سالانہ زرِ تعاون بھی ان مقامات پر جمع کرایا جاسکتا ہے ۔

کراچی : دفتر تنظیم اسلامی کمرہ ۱۱، داؤد منزل نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت ۔
شائننگ ٹریڈرز ، رفیع مینشن بالمقابل آرام باغ شاہراہ لیاقت فون ۲۱۷۷۰۹ ۔

نوٹ : ان دونوں مقامات سے محترم ڈاکٹر صاحب کے دروس و خطاب کے کیسٹ بھی مل سکتے ہیں۔

پشاور : دفتر تنظیم اسلامی۔ ثنار بلڈنگ پل پختہ نزد چوک یادگار پشاور ۔
ملتان : عبدالغنی صاحب ملتان پولٹری کارنر بالمقابل فاطمہ جناح ہسپتال ملتان ۔ فون ۷۵۸۹۱ ۔
کوئٹہ : دفتر تنظیم اسلامی جناح روڈ کوئٹہ اور قاری افتخار احمد صاحب خطیب مسجد طوبیٰ مسجد روڈ کوئٹہ فون نمبر ۷۷۲۶۵ ۔
راولپنڈی : فیری لینڈ اسکول ا ۔ بی ۔ ۴ اراولپنڈی سٹلائٹ ٹاؤن فون ۴۳۷۴۷ ۔
گوجرانوالہ : جناب پاشا اردن بک ۔ بی ۔ ۵۸۱ ۔ سٹلائٹ ٹاؤن ۔
سیالکوٹ : ریٹائرڈ کمانڈر محمد طفیل صاحب مکان نمبر ۲۲۸ عزیز بھٹی روڈ سیالکوٹ کینٹ ۔
دہاڑی : راؤ محمد جمیل سیکرٹری انسپکٹر ڈیویژن کیٹی دہاڑی ۔
ایبٹ آباد : خالد وحید صاحب سی ۔ ۹۴۷ اسول لائنز ۔ فون نمبر ۲۳۰۳ ، ۴۴۲۹ ۔
فیصل آباد : دفتر تنظیم اسلامی بالمقابل گورنمنٹ رحمانیہ ہائی سکول در مکان حاجی عبدالواحد قیم تنظیم پیپلز کالونی فون نمبر ۴۳۴۰۹ ۔
سوات : فلک سیر کارپوریشن ۔ جی ٹی روڈ ، منگورہ ۔
اسلام آباد : بسم اللہ خان صاحب بی / ۲۷۸ II / 6 G ۔
حویلی لکھا : محمد امین صاحب نزد مرکزی جامع مسجد مین بازار ۔

"میثاق اور حکمتِ قرآن" ہر دو کا علیحدہ علیحدہ سالانہ زرِ تعاون اندرونِ ملک -/۳۰ روپے ہے جبکہ دوسرے ممالک کے لئے زرِ تعاون حسبِ ذیل ہے :

- کینیڈا -/۱۵۰ روپے یا ۱۵ کینیڈین ڈالر ۔
- امریکہ ، افریقہ ، مغربی جرمنی ، نائیجیریا -/۱۵۰ روپے یا ۱۲ امریکن ڈالر ۔
- انگلینڈ ، ناروے ، متحدہ عرب امارات -/۱۰۰ روپے یا ۱۰ امریکن ڈالر ۔
- سعودی عرب ، کویت ، فلسطین ، مصر ، ایران -/۷۰ روپے یا ۷ امریکن ڈالر ۔
- انڈیا -/۵۰ روپے یا ۵ امریکن ڈالر ۔

سلسلۂ تقاریر آلـم

سُورۂ ھُود

ڈاکٹر اسرار احمد

السلام علیکم!

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
الٓرٰ کِتٰبٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُہٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ
مِنْ لَّدُنْ حَکِیْمٍ خَبِیْرٍ ۙ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا
اِلَّا اللّٰہَ ؕ اِنَّنِیْ لَکُمْ مِّنْہُ نَذِیْرٌ وَّبَشِیْرٌ

الٓرٰ کی سیریز کی دوسری سورہ ہود ہے جو ۱۲۳ آیات اور دس رکوعوں پر مشتمل ہے۔ اس سورۂ مبارکہ کا اکثر و بیشتر حصہ انباء الرسل پر مشتمل ہے یعنی رسولوں کے حالات و واقعات۔

اَنْبَاءُ جمع ہے نَبَاءٌ کی اور نَبَاءٌ کہتے ہیں کسی اہم خبر کو۔ یہ اصطلاح اسی سورۂ مبارکہ کی آیت نمبر ۱۲۰ میں وارد ہوئی ہے جس میں قرآن مجید میں انبیاء و رسل کے حالات و واقعات کے بیان کی جو اصل غرض و غایت ہے اس کو واضح کیا گیا ہے

ارشاد ہوتا ہے:

وَکُلًّا نَّقُصُّ عَلَیْکَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِہٖ فُؤَادَکَ وَجَآءَکَ فِیْ ہٰذِہِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَۃٌ وَّذِکْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ ۝

اے نبی! صلی اللہ علیہ وسلم، یہ جو رسولوں کے حالات و واقعات اور اُن کی خبریں ہم آپکو سناتے ہیں تو اِس لئے کہ اُن کے ذریعے

سے آپ کے قلبِ مبارک کو ثبات عطا فرمائیں اور آپ کے پاس اللہ کی طرف سے حق آچکا ہے۔ یہ تمام خبریں سرتاسر حق ہیں اور اہلِ ایمان کے لئے اِس میں نصیحت و موعظت ہے اور یاد دہانی بھی۔

اگر اِس سورۂ مبارکہ کا، سورۂ یونس کے ساتھ تقابل کیا جائے تو متعدد اعتبارات سے ایک عکسی نسبت (Reciprocal Relationship) سامنے آتی ہے۔

سورۂ یونس کے ۱۱ رکوعوں میں سے صرف دو رکوعوں میں رسولوں کے حالات مذکور ہیں جبکہ سورۂ ہُود کے دس رکوعوں میں سے صرف ۷ رکوع انباء الرسل پر مشتمل ہیں۔ پھر سورۂ یونس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات قدرے تفصیل کے ساتھ آئے جو تقریباً ڈیڑھ رکوع پر پھیلے ہوئے ہیں اور حضرت نوح علیہ السلام کے حالات اجمال کے ساتھ نصف رکوع میں اور بقیہ انبیاء و رسل کا ذکر اجمالاً ہوا۔ جبکہ سورۂ ہُود میں پورے دو رکوعوں میں حضرت نوح علیہ السلام کے حالات و واقعات کا بیان ہے اور پھر ایک ایک رکوع میں حضرت ہُود، حضرت صالح، حضرت ابراہیم، حضرت لوط اور حضرت شعیب (علیٰ نبیّنا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام) کا ذکر ہے اور آخیر میں صرف چند آیات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے حالات و واقعات میں وہ منظر بڑا دردانگیز ہے۔ بڑا (Pathetic) ہے جس میں اُن کی نگاہوں کے سامنے اُن کے بیٹے کے غرق ہو جانے کا بیان ہوا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک عجیب نقشہ سامنے آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ایک جلیل القدر پیغمبر اولوالعزم من الرسل میں سے ایک نہایت اولوالعزم رسول کا ایک بیٹا اُن کی آنکھوں کے سامنے غرق ہو رہا ہے لیکن معاملہ وہی ہے جو ایک شاعر نے عربی میں کہا ہے ؎

اَلرَّبُّ رَبٌّ وَاِنْ تَنَزَّلَ
وَالْعَبْدُ عَبْدٌ وَاِنْ تَرَقّٰی

رب، رب ہی ہے خواہ وہ کتنا نزولِ اجلال فرمالے اور بندہ، بندہ

ہی رہتا ہے خواہ وہ کتنے ہی بلند مقام پر فائز ہو جائے۔
ذرا اِس منظر کشی کو ملاحظہ کیجیے، ارشاد ہوتا ہے:

وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ۔ "اور وُہ کشتی انہیں لے کر چل رہی تھی۔ ایسی موجوں میں جو پہاڑوں کی مانند تھیں"

وَنَادٰى نُوْحُ ۨ ابْنَهٗ وَكَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ اور نوحؑ نے پکارا اپنے بیٹے کو، اے میرے بچے ہمارے ساتھ اِس کشتی میں سوار ہو جاؤ اور کافروں کے ساتھ نہ رہو۔ اُن کا ساتھ مت دو۔

لیکن وہ کافر بیٹا، اس کا سارا تکیۂ توکل، دار و مدار و انحصار مادی اسباب و وسائل پر تھا۔ اس نے جواب میں کہا۔

قَالَ سَاٰوِيْۤ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ ۝ "یہ سامنے پہاڑ ہے، میں ابھی پہاڑ پر چڑھ جاتا ہوں۔ وہ پہاڑ مجھے اس پانی سے بچالے گا ——— اور میں اِس طوفان میں غرق ہونے سے بچ جاؤں گا۔"

حضرت نوحؑ فرماتے ہیں:

قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ آج کے دن اللہ کے حکم سے بچانے والی کوئی چیز نہیں۔ ہاں جس پر اللہ ہی رحم فرما دے۔

وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ ۚ ذرا اِس دردانگیز منظر کا تصور کیجیے۔ یہ مکالمہ ابھی ہو ہی رہا تھا کہ "بڑی موج باپ اور بیٹے کے مابین حائل ہو گئی۔"

فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ۚ اور حضرت نوحؑ کا بیٹا اُن کی نگاہوں کے سامنے غرق ہو گیا۔ یہ منظر دیکھ کر، بربنائے طبعِ بشری حضرتِ نوحؑ کی زبان پر فریاد آگئی جو ایک دکھی باپ کے دل کی فریاد ہے:

فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ وَ اِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِیْنَ ۝

"پروردگار! میرا بیٹا میرے اہل میں سے تھا اور تیرا وعدہ بالکل برحق ہے اور آپ نے وعدہ کیا تھا کہ میرے اہل وعیال کو بچالے گا اور تو تمام حکم کرنے والوں اور فیصلے کرنیوالوں میں بہترین فیصلہ کرنے والا ہے"۔

جواب سنئے!

قَالَ یٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اللہ نے جواباً ارشاد فرمایا اے نوح! وہ تیرے اہل میں سے نہیں۔

اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ ۫ اُس کے اعمال اچھے نہیں۔ بلکہ وہ تو مجسم ایک عملِ بد کی شکل اختیار کرچکا تھا۔

فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۫ مجھ سے ایسی چیز کا سوال مت کرو کہ جس کے لئے تمہارے پاس علم نہ ہو۔

اِنِّیْۤ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ ۝ اے نوح! میں تمہیں نصیحت کر رہا ہوں کہ تم جاہلوں اور نادانوں میں سے مت بنو۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْۤ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَیْسَ لِیْ بِهٖ عِلْمٌ ۔ اب یہ ہے مقامِ عبدیت، اللہ کا وہ بندہ بارگاہِ خداوندی میں فوراً توبہ کر رہا ہے۔

"پروردگار! میں تیری ہی پناہ میں آتا ہوں، اس سے کہ میں تجھ سے کوئی ایسا سوال کروں جس کے لئے میرے پاس علم نہ ہو"۔

وَاِلَّا تَغْفِرْ لِیْ وَتَرْحَمْنِیْۤ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝ اور اے رب! اگر تُو نے مجھے بخش نہ دیا، معاف نہ کر دیا اور تیری رحمت نے مجھے اپنے سائے میں نہ لے لیا تو میں خسارہ پانے والوں میں سے ہو جاؤں گا۔

اللہ اکبر! یہ مقام ہوتا ہے انبیاء و رسل اور صالحین کا کہ خطا کا فوراً اعتراف، اُس پر اظہارِ ندامت، اقرار و انابت اور استغفار و توبہ۔ یہ ہے مقامِ عبدیت! ہمارے نبیِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے اِن آیاتِ مبارکہ میں کتنی تسلی و تشفی ہے

آپؐ کا دل کس قدر زخمی تھا۔ یہ دیکھ کر کہ آپؐ کے قریبی اعزہ و اقارب بھی ایمان نہیں لا رہے۔ آپؐ کے انتہائی چہیتے اور محبوب رشتہ دار کفر پر اور انکار و اعراض پر اڑے ہوئے ہیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی وجہ سے جو صدمہ تھا، اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کا یہ واقعہ سنا دیا تاکہ اس کے ذریعے سے حضورؐ کے زخمی دل پر بھی مرہم کا ایک پھاہا رکھ دیا جائے۔

اس کے بعد حضرت ہود علیہ السلام اور اُن کی قوم یعنی عاد کا ذکر ہے۔ پھر ایک رکوع میں حضرت صالح علیہ السلام اور اُن کی قوم، قومِ ثمود کا ذکر ہے۔ اس کے ضمن میں ایک بڑا پیارا قول نقل ہوا ہے۔ قومِ صالح کا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبوت و رسالت سے سرفراز ہونے سے قبل اُن کی نگاہ میں حضرتِ صالح کی کتنی قدر و منزلت تھی۔ انہوں نے حضرتِ صالح سے مخاطب ہو کر کہا:

قَالُوْا یٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِیْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَا ، اے صالح! یہ تم نے کیا دعوت شروع کر دی۔ آباؤ اجداد کے دین سے بغاوت کر دی ہے۔ ہمیں تم حکم دے رہے ہو کہ ہم اپنے آباؤ اجداد کا دین چھوڑ دیں؟ تم سے تو ہماری بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ تم تو ہماری آنکھوں کا تارا تھے۔ تم تو ہمارے محبوب تھے۔ تمہارے اندر تو ہمیں صلاحیتیں نظر آ رہی تھیں۔ ہم سمجھتے تھے کہ تم باپ دادا کا نام روشن کرو گے! لیکن تم نے تو بالکل الٹی روش اختیار کر لی۔

یہی معاملہ تھا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ آپؐ قریش کی آنکھوں کا تارا تھے۔ آپ اپنی قوم کے انتہائی محبوب فرد تھے۔ آپ کو "الصادق" اور "الامین" کے خطابات اس قوم نے عطا کئے تھے جس نے اجرائے وحی اور دعوتِ توحید کے بعد بدترین دشمنی کی روش اختیار کر لی۔ آپ سے تمسخر و استہزاء کیا۔ آپ پر تشدد اور مصائب توڑے تو یہ گویا کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے انبیاء و رسل کے حالات و واقعات کی صورت میں گزشتہ ایام کا ایک آئینہ رکھا جا رہا ہے۔ آپ کو اور مؤمنین صادقین کو بتایا جا رہا ہے کہ دعوتِ توحید پیش کرنے اور قبول کرنے والوں کو اس ابتلا

سے دوچار ہونا عین سنتِ الٰہی ہے۔

پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہے کہ جب فرشتے حضرت اسحٰقؑ کی ولادت کی بشارت لے کر آئے اور حضرتِ سارہؑ نے اس پر تعجب کا اظہار کیا کہ کیا میں اس بڑھاپے میں بچہ جنوں گی؟ جبکہ میرے شوہر بالکل بوڑھے ہو چکے ہیں اور میں بانجھ ہوں تو کیا اس حالت میں بھی ہمارے ہاں اولاد ہوگی! تو اس بات پر فرشتوں کا جواب ملاحظہ ہو:

اَتَعْجَبِیْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰہِ رَحْمَتُ اللّٰہِ وَبَرَکٰتُہٗ عَلَیْکُمْ اَھْلَ الْبَیْتِ اے رسول کے اہلبیت، اے رسول کے گھر والو، اے رسول کی بیوی اللہ کی سلامتی اللہ کی رحمتیں ہوں تم پر۔ کیا تمہیں اللہ تعالیٰ کے معاملے میں تعجب ہو رہا ہے۔ کیا تم اللہ کے بارے میں اس بات کو بڑا عجیب سمجھ رہی ہو کہ وہ تمام مادی اسباب و وسائل سے بے نیاز ہو کر جو چاہے کر گزرے۔ اس کی شان تو یہ ہے کہ وہ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے:

فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ط "اس کو صرف یہ کہنا ہوتا ہے کہ ہو جا تو وہ بات ہو جاتی ہے"

پھر حضرت لوط کا ذکر آتا ہے (علیہ الصلوٰۃ والسلام) اور وہ جس صورتحال سے دوچار ہوئے تھے کہ انکی قوم نے گھیر لیا تھا انکے گھر کو جب فرشتے ان کے پاس خوبصورت لڑکوں کی شکل میں آئے تھے اور یہ معلوم رہے کہ یہ قوم انتہائی گھناؤنے اور بدترین sexual Perversion یعنی امرد پرستی میں مبتلا تھی جس میں حضرت ھود علیہ السلام کو بھیجا گیا تھا۔ جب وہ قوم خوبصورت لڑکوں کو دیکھ کر اپنی شہوت سے مغلوب ہو کر حضرت لوط علیہ السلام کے گھر کو گھیرے میں لئے ہوئے ہے۔ اسوقت انتہائی حسرت کے انداز میں حضرت لوط فرماتے ہیں۔

اَلَیْسَ مِنْکُمْ رَجُلٌ رَّشِیْدٌ ط کیا تم میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جو شریف ہو اور بامروّت ہو۔

جب اس پورے مجمع میں سے کوئی شخص بھی ایسا نہ نکلا جو حضرت لوط علیہ السلام کی حفاظت کرتا اور انہیں بچاتا قوم کے اس اقدام سے۔ تو انہوں نے نہایت حسرت بھرے الفاظ ادا کئے:

لَوْ اَنَّ لِیْ بِکُمْ قُوَّۃً اَوْ اٰوِیْ اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ کاش کہ میرے پاس تمہارے مقابلے میں کوئی طاقت ہوتی یا میں کسی مضبوط قلعے کے اندر پناہ لے سکتا۔

حضرت لُوط علیہ السلام کے اِس قول کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ " اللہ تعالیٰ لُوط پر رحم فرماتے۔ وہ تو پہلے بھی انہیں ایک مضبوط سہارا حاصل تھا، وہ مضبوط قلعے میں تھے اور وہ مضبوط قلعہ تھا اللہ تعالیٰ کی حفاظت۔ بہرحال حضرت لُوطؑ اور اُن کے متبعین بچا لئے گئے اور پتھروں کی زبردست بارش سے یہ قوم ہلاک کر دی گئی۔

اِس کے بعد حضرت شعیب کا ذکر آتا ہے (علیہ الصلوٰۃ والسلام) اُن کی قوم میں معاشی بے راہ روی بہت آچکی تھی۔ تولنے میں کمی بیشی۔ اِسی طریقے سے دھوکہ و فریب۔ لُوٹ مار کا معاملہ۔ رہزنی، یہ اُن کے ہاں بہت زیادہ رواج پا چکی تھی۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے جب اُنہیں اِن باتوں سے روکا تو اُن کا قول ملاحظہ ہو:

قَالُوْا یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُکَ تَاْمُرُکَ اَنْ نَّتْرُکَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا۔ یہ ہے سرمایہ دارانہ ذہنیت! انہوں نے کہا کہ اے شعیب! کیا تمہاری نماز تمہیں یہ سکھاتی ہے کہ ہم اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں؟ کہ جن کی بندگی اور پرستش ہمارے آباؤ اجداد کرتے تھے اور تمہاری نماز اور تمہارا دین یہ حکم دیتا ہے اور ہمیں روکتا ہے اِس سے کہ ہم اپنے اموال کے بارے میں جو چاہیں کریں۔ ہم اپنے مالی معاملات کو جس طرح چاہیں نپٹائیں۔ یہ آزادی ہے جو آج کا سرمایہ دار بھی چاہتا ہے۔ حلال و حرام کی حدود و قیود اسے پسند نہیں ہیں۔ شریعت میں صحیح اور غلط، جائز و ناجائز کا جو فرق اور تمیز ہے وہ اس کو پسند نہیں ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ وہ من مانی کرے۔ اُس پر کوئی روک ٹوک اور قدغن نہ ہو

اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ہم اپنے اموال میں جو چاہیں کریں۔ ہمیں اِس کی پوری چھوٹ اور آزادی ہونی چاہیئے۔

آخر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا ماجرا بیان ہوا ہے۔ پھر سورۂ مبارکہ کے آخیر میں نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو ہدایات دی گئی ہیں اور گویا آپ کی وساطت سے آپ کے جاں نثاروں کے لئے ہدایات ہیں:

پہلی ہدایت:۔ فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَؕ اے نبی! آپؐ بھی اور جو بھی آپؐ کے ساتھ ایمان لائے ہیں۔ جنہوں نے اللہ کی جناب میں رجوع کیا ہے آپؐ کی اتباع میں۔ آپؐ استقامت اور صبر و ثبات کے ساتھ اپنے موقف پر ڈٹے رہیں۔

دُوسری ہدایت: وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِؕ اور نماز کا اہتمام کیجئے، نماز کو قائم کیجئے۔ دن کے دونوں اطراف میں بھی صبح وشام کے اوقات میں اور کچھ حصہ رات کا بھی اِس مقصد کے لئے وقف کیجئے۔

تیسری ہدایت: وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَؕ اور صبر کیجئے، جھیلئے، برداشت کیجئے، جیسے کہ ہمارے اولُوالعزم پیغمبر صبر کرتے رہے ہیں۔ حالات ہمیشہ یہی نہیں رہیں گے۔ نصرتِ خداوندی شاملِ حال ہوگی۔ فتح و نصرت اور کامرانی آپ کے قدم چُومے گی۔ احسن کام کرنے والوں کا اجر اللہ ضائع نہیں کرتا۔

آخری ہدایت: وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنَّا عٰمِلُوْنَؕ اور اے نبیؐ! ڈنکے کی چوٹ کہہ دیجئے اُن لوگوں سے جو ایمان نہیں لا رہے ہیں کہ تم بھی کر گزرو جو کر سکتے ہو۔ ہم بھی کر رہے ہیں جو ہمارے بس میں ہے۔

وَانْتَظِرُوْا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ○ اب تم بھی انتظار کرو کہ حکمِ خداوندی کیا اور کب آتا ہے اور ہم بھی اس کا انتظار کر رہے ہیں۔

بَارَكَ اللّٰهُ لِيْ وَلَكُمْ فِي الْقُرْاٰنِ الْعَظِيْمِ ؕ وَنَفَعَنِيْ وَاِيَّاكُمْ بِالْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ؕ

❋
❋

(قسط نہم)

ایمان اور اس کے ثمرات و مضمرات

(سورہ تغابن کی روشنی میں)

ڈاکٹر اسرار احمد

یہ جوان کافروں کا استبعاد اور استعجاب تھا، اس کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے کہ زَعَمَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ یُّبْعَثُوْا ؕ ان کو یہ مغالطہ ہو گیا ہے کہ وہ اٹھائے نہیں جائیں گے یا اٹھائے نہیں جا سکیں گے۔ یہ مضمون سورۂ قیامہ میں بڑے شرح و بسط کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ اور یہ سورہ بھی ہمارے منتخب نصاب میں شامل ہے۔ ان شاء اللہ موقع ملا تو اس پوری سورت کا کبھی آئندہ اجتماعی مطالعہ کریں گے۔ اس مرتبہ وقت کی کمی کے باعث اس کا درس نہیں ہو سکے گا۔ البتہ میں اس موقع پر اس سورت کی چند آیات کا مختصر بیان کروں گا جن کا تعلق اس مضمون سے ہے، جو اس وقت ہمارے زیرِ مطالعہ ہے۔ وہاں فرمایا اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ؕ بَلٰی قٰدِرِیْنَ عَلٰٓی اَنْ نُّسَوِّیَ بَنَانَهٗ ۝ "کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہیں کر سکیں گے"۔ بڑا ہی احمق ہے یہ انسان، اس نے ہماری قدرت کے بارے میں کیسا غلط تصور قائم کر رکھا ہے۔ "کیوں نہیں ہم تو قادر ہیں اس پر کہ اس کے ایک ایک جوڑ اور پور کو درست کر دیں"۔ یہاں دلیل کیا ہے؟ قدرتِ خداوندی۔ اگر خدا کو مانا ہے کمالِ قدرت کے ساتھ، تو پھر تمہارے لئے یہاں استبعاد و استعجاب کا کوئی مقام نہیں۔ اور اگر اس کو ایک عاجز اور ضعیف، کمزور اور بیچارہ ہستی مانتے ہو تو یہ خدا نہ ہوا۔ پس جس طرح دو اور دو چار ہوتے ہیں، اسی طرح تم کو لازماً ماننا پڑے گا کہ یہ تعجب بے بنیاد ہے۔ سورہ قیامہ کو آخر میں اسی مضمون پر جا کر ختم کیا ہے کہ تم ذرا دیکھو تو سہی، کہاں کہاں سے تمہیں پیدا کیا ہے۔ اَلَمْ یَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِیٍّ یُّمْنٰی ۝ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰی ۝ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَیْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰی ۝ تم خود اپنی حقیقت پر غور کرو کہ تم گندے پانی کی ایک بوند تھے، جو ٹپکائی گئی، اسی سے ایک لوتھڑا بنا دیا پھر اس لوتھڑے کو مزید ترقی دی، تمہیں حیات بخشی، تمہاری۔۔۔

صورت گری کی اور تمہیں کھڑا کر دیا، اسی بوند میں سے مذکر و مؤنث بالکل مختلف اصناف برآمد کر دیئے۔ تو جو یہ قدرت رکھتا ہے کیا وہ اسی طرح مردوں کو زندہ نہیں کر سکتا۔ اَلَیْسَ ذٰلِکَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓی اَنْ یُّحْیِیَ الْمَوْتٰی ؕ یہاں سارا استدلال اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہے اس لئے کہ قیامت اور حشر و نشر کا جو مثبت استدلال ہے وہ تو ہے اخلاقی استدلال۔ نیکی اور بدی اگر حقیقی قدریں ہیں تو لازماً نتائج نکلنے چاہئیں۔ جزا و سزا ہونی چاہیئے اور دوسرا عالم لازماً ہونا چاہیئے۔ یہ معاد کا مثبت استدلال ہوا منفی استدلال یہ کہ کفار تعجب کرتے تھے کہ یہ کیسے ہوگا تو ان کے اس استعجاب پر اللہ کی قدرتِ کاملہ سے استدلال لایا جائے گا۔ اَفَعَیِینَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ، کیا ایک مرتبہ پیدا کرنے کے بعد ہم عاجز ہو گئے ہیں، تھک گئے ہیں، ہماری قوتِ تخلیق ختم ہو گئی ہے! کیا یہ تصور ہے تمہارا! تو ان تصورات کے ابطال کے لئے جو دلیل آئے گی وہ اللہ کی قدرت سے آئے گی۔ اسی لئے پہلے منوالیا اور تسلیم کرالیا کہ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ جب اس بات کو مان لیا تو آگے تمہارے بولنے کے لئے اب کوئی موقع اور گنجائش نہیں۔ ہاں اگر خدا کو عاجز مانتے ہو تو پھر دوسری بات ہے۔ اعتراض کرو۔ فرمایا۔ زَعَمَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ یُّبْعَثُوْا ؕ ان کو یہ مغالطہ ہو گیا ہے کہ ان کو اٹھایا نہیں جائے گا۔ یا اٹھایا نہیں جا سکے گا۔ آگے جو بیان آ رہا ہے وہ بہت ہی اہم ہے۔ اس لئے میں ایک ایک لفظ کو لے کر اس کی تشریح کروں گا۔ فرمایا، قُلْ۔ اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیجئے۔ یہاں توجہ کیجئے کہ ان کے اس زعم کے براہ راست ابطال کے بجائے نبی اکرمؐ کو حکم ہو رہا ہے کہ آپ فرما دیجئے۔ کیا فرمائیں؟ بَلٰی۔ کیوں نہیں۔ وَرَبِّیْ اور میرے رب کی قسم ہے، میں اپنے پروردگار کی قسم کھا کر کہتا ہوں لَتُبْعَثُنَّ تم لازماً اٹھائے جاؤ گے۔ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ اور پھر تمہیں لازماً جتلا دیا جائے گا، جو کچھ تم نے کیا ہوگا۔ وَذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ ۝ اور یہ اللہ پر بڑا آسان ہے۔ اسے قادر مانا ہے تو یہ آسان ماننا پڑے گا۔ یا پھر اسے عاجز مانو، اگر یہ تمہارے لئے بڑے تعجب کی بات ہے۔ اسی لئے سورۂ رعد میں فرمایا۔ وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُھُمْ ءَاِذَا کُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ ؕ اگر تعجب ہی کرنا ہے تو تعجب انگیز بات تو ان کی ہے کہ یہ اس قادرِ مطلق کے متعلق یہ تصور رکھتے ہیں کہ جب مٹی ہو جائیں گے تو دوبارہ کیسے پیدا کئے جائیں گے۔ خدا کا دوبارہ پیدا کرنا تعجب انگیز نہیں ہے بلکہ تعجب انگیز ان کا قول ہے کہ وہ خدا جس نے ان کو پہلی بار وجود بخشا وہ دوبارہ کیسے پیدا کر دے گا۔؟ اگر خدا کو مانتے ہو، اسے خالق تسلیم کرتے ہو اور اس کو قادرِ مطلق سمجھتے ہو تو اس تعجب

کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ سورۃ یٰسین میں کفار کے اس سوال کے جواب میں کہ ہماری بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا! نبی اکرمؐ نے فرمایا۔ قُلْ یُحْیِیْهَا الَّذِیْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِیْمٌ ۝ آپؐ کہہ دیجئے کہ وہ دوبارہ پیدا کرے گا جس نے پہلی بار ان کو حیات بخشی اور وجود عطا کیا اور وہ سب طرح پیدا کرنا جانتا ہے۔ یہاں بھی دلیل اللہ کی صفتِ تخلیق، صفتِ علم اور صفتِ قدرت سے لائی گئی ہے۔ فرمایا" قُلْ بَلٰی وَرَبِّیْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ؕ یہاں اس بات پر غور کر لیجئے جو میں نے سورہ آل عمران کے آخری رکوع کی ابتدائی آیات کے درس میں کہی تھی کہ ایمان عقلی سے ایمان سمعی تک (مرضی نامرضی قدمے فاصلہ دارد) فرق بہت معمولی معلوم ہوتا ہے لیکن بڑا عجیب فرق ہے۔ ایمان عقلی انسان کو صرف اشارہ دیتا ہے اور اسے اس مقام تک لے کر آتا ہے کہ "ہاں ایسا ہونا چاہیئے۔ کوئی خدا موجود ہے اور وہ تمام صفاتِ کمال سے متصف ہے اور کوئی جزاء و سزا بھی ہونی چاہیئے۔ کوئی دوسرا عالم ہونا چاہیئے، بدلہ ملنا چاہیئے، یہاں تک تو عقل لے آتی ہے۔ لیکن یہ بات کہ لازماً یوم حساب آکر رہے گا۔ لازماً حساب و کتاب ہوگا۔ لازماً جزاء و سزا مل کر رہے گی میں جانتا ہوں کہ یوں ہی ہے" یہ بات کہتا ہے رسول۔ اور وہ یہ بات اپنے علم حقیقی اور علم ذاتی کی بنیاد پر کہتا ہے۔ اپنے مشاہدہ کی بنیاد پر کہتا ہے۔ اسے جو اس علم غیب کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے، اس کو جو حقائق کائنات دکھائے جاتے ہیں۔ یہ جو جنت و دوزخ کی معراج میں سیر کرائی گئی وہ یوں ہی نہیں تھی۔ یہ کوئی تفریح (Excursion) نہیں تھی۔ یہ در حقیقت اس لئے تھا کہ رسالت میں وہ یقین محکم و مجسم پیدا ہو جائے کہ وہ پھر اس ذاتی یقین و مشاہدہ کی بنیاد پر شہادت دے کہ قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید۔ جو کچھ کہہ رہا ہوں دیکھا ہوا کہہ رہا ہوں۔ میرے لئے یہ غیب نہیں ہے۔ بلکہ مجھے مشاہدہ کرا دیا گیا ہے۔ میرے لئے حجابات دور کر دیئے گئے ہیں تب ہی وہ زور پیدا ہوا قُلْ بَلٰی وَرَبِّیْ۔ کہہ دیجئے کیوں نہیں۔ مجھے میرے رب کی قسم ہے کہ ایسا ہو کر رہے گا۔ لَتُبْعَثُنَّ۔ تم لازماً اٹھائے جاؤ گے اور پھر تم لازماً جتلائے جاؤ گے جو کچھ تم کرتے رہے ہو۔ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ؕ۔ میں پچھلے درس میں بتا چکا ہوں کہ لام مفتوح مضارع سے پہلے اور پھر نون مشدد آخر میں ہو تو اس سے زیادہ تاکید کا کوئی اور اسلوب اور انداز عربی زبان میں نہیں ہے۔ آغازِ نبوت کے جو حضورؐ کے تبلیغی اور دعوتی خطبات، احادیث میں بیان ہوئے ہیں ان میں سے ایک خطبہ کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ اسی لفظ" قُلْ" پر حضورؐ کا عمل ہے، بڑا ہی پُر تاثیر خطبہ ہے۔ اسے یاد کر لینا چاہیئے، ہر شخص کو جسے لگاؤ ہے محبت

ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے) بالکل آغاز میں حضورؐ نے ایک مرتبہ بنو ہاشم اور قریش کے چیدہ چیدہ لوگوں کو جمع کیا پھر آپؐ نے خطبہ ارشاد فرمایا۔ پہلے پورا خطبہ سن لیجئے، پھر میں اس کا ترجمہ اور تشریح کروں گا۔

"اِنَّ الرَّائِدَ لَا یَکْذِبُ اَھْلَهٗ وَاللّٰهِ لَوْ کَذَبْتُ النَّاسَ جَمِیْعًا مَا کَذَبْتُکُمْ وَلَوْ غَرَرْتُ النَّاسَ جَمِیْعًا مَا غَرَرْتُکُمْ وَاللّٰهِ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اِنِّیْ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ خَاصَّةً وَاِلَی النَّاسِ کَافَّةً۔ وَاللّٰهِ لَتَمُوْتُنَّ کَمَا تَنَامُوْنَ ثُمَّ لَتُبْعَثُنَّ کَمَا تَسْتَیْقِظُوْنَ ثُمَّ لَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ثُمَّ لَتُجْزَوْنَ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَبِالسُّوْءِ سُوْءًا وَاِنَّهَا لَجَنَّةٌ اَبَدًا اَوْ لَنَارٌ اَبَدًا"

فرمایا، اِنَّ الرَّائِدَ لَا یَکْذِبُ اَھْلَهٗ دیکھو قافلہ کا جو راہنما ہوتا ہے۔ رائد اصل میں کہتے ہیں اس شخص کو جو قافلہ سے ایک منزل آگے چلے اور جو اگلا پڑاؤ متعین کرے، کہاں ٹھہریں گے، کہاں پانی ہے، چارہ ہے، اس لئے کہ سفر عرب کا ہے، ذرا ادھر ادھر ہو جائیں تو پورا قافلہ سخت خطرہ میں پڑ جائے گا۔ اگر پانی اور چارہ نہ ملا ــــ لہٰذا جو معتمد ترین انسان ہوتا تھا اس کو اس خدمت پہ مامور کیا جاتا تھا کہ جاؤ آگے جیسے کہ سورۂ یوسف میں آیا، فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ فَاَدْلٰی دَلْوَهٗ ط آگے آگے چلنے والا جو پانی کی ٹوہ لے رہا ہے کہ اس کنویں میں پانی بھی ہے کہ نہیں فرمایا۔ اِنَّ الرَّائِدَ لَا یَکْذِبُ اَھْلَهٗ یہاں سے حضورؐ گفتگو کا آغاز فرما رہے ہیں کہ کبھی رائد نے بھی اپنے قافلہ کو دھوکا دیا ہے؟ نہیں دیا کیونکہ وہ معتمد ترین شخص ہوتا ہے تو حضورؐ اپنی شخصیت کو بطور تمثیل پیش کر کے فرما رہے ہیں کہ میرا معاملہ تمہارے ساتھ وہی ہے جو کسی قافلہ کے ساتھ رائد کا ہوتا ہے۔ یہ کیوں؟ اس کو بھی سمجھ لیجئے:۔ ایک تو اس پہلو سے مثال ہے اور تشبیہہ ہے کہ رائد ہوتا ہے سب سے زیادہ معتمد علیہ اور مجھے تو خود کہتے ہو کہ میں الصادق اور الامین ہوں۔ دوسرے اس پہلو اور اعتبار سے کہ رائد آگے چلتا ہے اور اگلی منزل کی خبر دیتا ہے اور میں پورے قافلۂ انسانیت کو اس کی زندگی کی اگلی منزل کی خبر دے رہا ہوں۔ میں عالم آخرت کا خبر دینے والا بن کر آیا ہوں۔ نذیر بن کر آیا ہوں۔ بشیر بن کر آیا ہوں۔ وہاں کا انذار و تبشیر لئے ہوئے ہوں۔ اس اعتبار سے بھی رائد ہوں۔ اِنَّ الرَّائِدَ لَا یَکْذِبُ اَھْلَهٗ۔ وَاللّٰهِ۔ خدا کی قسم لَوْ کَذَبْتُ

النَّاسَ جَمِيْعًا، مَا كَذَبْتُكُمْ۔ اگر بفرضِ محال میں تمام انسانوں سے جھوٹ بول سکتا تب بھی تم سے تو نہ بولتا۔ تم میرے عزیز ہو، اقارب ہو، رشتہ دار ہو، بھائی بند ہو۔ تم سے جھوٹ بولتا؟ وَلَوْ غَرَرْتُ النَّاسَ جَمِيْعًا مَا غَرَرْتُكُمْ

اگر انسانوں کو بفرضِ محال میں دھوکا اور فریب دے سکتا، تب بھی یہ دھوکے اور فریب کا معاملہ تم سے تو نہ کرتا۔ یہ ہے آغازِ خطبہ کا اسلوب دیکھئے۔ شان دیکھئے کہ کس انداز سے بات ہو رہی ہے۔ مدلل بھی ہے اور پھر اس میں ایک اپیل بھی ہے، پرسنل اپیل ہے اور اپنی شخصیت کو سامنے رکھا جا رہا ہے اس کے بعد حضورؐ اپنی اصل دعوت شروع فرماتے ہیں۔ وَاللّٰهِ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔ اس خدا کی قسم کہ جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ کوئی معبود نہیں۔ کوئی حاکم اور آقا نہیں ــــ یہ بات کہنے والے کون ہیں؟ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ جن کی شخصیت کا لوہا خود معاشرہ مان چکا ہے اور الصادق اور الامین کا خطاب دے چکا ہے۔ گویا کہ خود معاشرہ اپنے ہاتھ ترڑوا چکا ہے۔ کوئی بولے تو کیا بولے؟ جھوٹ کا الزام تو ابوجہل نہیں لگا سکا نبی اکرمؐ پر۔ اسی بات کو قرآن مجید میں سورۂ انعام میں اللہ تعالیٰ یوں بیان فرماتا ہے "فَاِنَّهُمْ لَا یُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِیْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ یَجْحَدُوْنَ۔ اے نبیؐ آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں یہ آپ کی تکذیب نہیں کر رہے، خدا کو جھٹلا رہے ہیں۔ آپؐ کو تو انہوں نے آج تک نہیں کہا کہ آپؐ جھوٹے ہیں۔ آپؐ پر تو بڑے سے بڑا کٹر سے کٹر دشمن اور منکر خدا بھی کذب کا الزام نہ لگا سکا۔ وَاللّٰهِ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اِنِّیْ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ خَاصَّةً وَّاِلَی النَّاسِ كَافَّةً: مجھے اس خدا کی قسم ہے جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں کہ میں واقعتاً اسی کا بھیجا ہوا ہوں، اسی کا فرستادہ ہوں۔ اسی کا رسول ہوں، تمہاری طرف بالخصوص اور پوری نوعِ انسانی کی طرف بالعموم۔ اس خطبہ میں بڑے اہم نکات ہیں۔ اسی ایک جملہ سے حضورؐ کی دو بعثتیں متعین ہو گئیں۔ بعثتِ خصوصی اِلٰی اہل العرب، اور بعثتِ عمومی الیٰ کافۃ الناس۔ اب وہ بات حضورؐ ارشاد فرما رہے ہیں جو سورۂ تغابن کے اسی "فَعَلَ" پر کِل نظر آتا ہے۔ وَاللّٰهِ خدا کی قسم لَتَمُوْتُنَّ كَمَا تَنَامُوْنَ۔ تم لازماً مر جاؤ گے، تم پر لازماً موت کی نیند طاری ہو جائے گی۔ جیسے روزانہ رات کو تم سو جاتے ہو۔ جیسے روزانہ رات کو یہ نیند، یہ موت کی چھوٹی بہن آتی ہے اور تم پر مسلط ہو جاتی ہے، ایسے ہی تمہاری زندگی کی ایک شام ایسی آئے گی کہ پوری زندگی کی شام کہ جس میں تم موت کی نیند سو جاؤ گے۔ یہ بھی روز کا مشاہدہ ہے۔ اس سے بھی انکار کی کسی کو

محال نہیں ہے۔ ایسے مسلمات سے گفتگو کی جا رہی ہے جو مختلف فیہ نہ ہوں وَاللّٰہِ لَتَمُوْتُنَّ کَمَا تَنَامُوْنَ۔ ثُمَّ لَتُبْعَثُنَّ کَمَا تَسْتَیْقِظُوْنَ۔ اللہ کی قسم کہ تم لازماً ایک دن موت کی نیند سو جاؤ گے جیسے ہر رات کو سوتے ہو، پھر تم کو لازماً اٹھا لیا جائے گا جیسے روزانہ صبح بیدار ہوتے ہو، جیسے روزانہ نیند سے اٹھتے ہو، ویسے ہی ایک دن اس موت کی نیند سے بھی آنکھ کھلے گی" فرق یہ ہوگا کہ روزانہ اسی عالم میں جاگتے ہو اور وہ آنکھ کھلے گی کسی اور عالم میں لیکن خدا کے نزدیک اس میں کوئی فرق نہیں ہے۔ خدا تمہیں جس طرح روزانہ صبح جگاتا ہے، ایسے ہی اس دن تمہیں جگائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ صبح اٹھنے کی حضورؐ کی دعا وہ ہے جس میں یہ تشبیہ دی گئی ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَحْیَانِیْ بَعْدَ مَا اَمَاتَنِیْ وَاِلَیْہِ النُّشُوْرُ۔ اس اللہ کا شکر ہے جس نے مجھے از سرِ نو زندہ کیا۔ اس کے بعد کہ مجھ پر موت کی نیند طاری کر دی تھی اور بالآخر اسی طرح اس کی طرف لوٹ جاؤں گا" یہ ریہرسل ہے جس کی ہر صبح آپ کو تعلیم و تلقین کی گئی ہے اس میدانِ حشر میں جاگنے کی اور میرا خیال ہے کہ اگر کسی بندے کی یہ عادت بن گئی ہے اور اس کا یہ معمول ہو گیا ہے کہ جب وہ روزانہ صبح کو اٹھتا ہے تو یہ کلمات آپ سے آپ اس کی زبان پہ جاری ہو جاتے ہیں تو اِنْ شَاءَ اللّٰہ۔ جس روز وہ میدانِ حشر میں موت کی نیند سے جاگے گا تو یقیناً یہی کلمات اس کی زبان پہ جاری ہوں گے۔ الحمد للہ الذی احیانی بعد ما اماتنی والیہ النشور۔ یہ کلمہ بامعنی اسی وقت ہوگا۔ روزانہ مجاز کے طور پر بولا جا رہا ہے، حقیقتاً اس کا اطلاق اس وقت ہوگا وَاللّٰہِ لَتَمُوْتُنَّ کَمَا تَنَامُوْنَ ثُمَّ لَتُبْعَثُنَّ کَمَا تَسْتَیْقِظُوْنَ ثُمَّ لَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعْمَلُوْنَ۔ پھر لازماً تم سے تمہارے اعمال کی پوچھ گچھ ہوگی۔ لازماً تمہارا محاسبہ ہوگا۔ تمہارے اعمال کا حساب و کتاب لیا جائے گا۔ ثُمَّ لَتُجْزَوُنَّ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَبِالسُّوْءِ سُوْءًا۔ پھر لازماً جزا مل کر رہے گی، بدلہ مل کر رہے گا۔ بھلائی کا بھلائی کے ساتھ اور برائی کا برائی کے ساتھ۔ اور وہ جزا و بدلہ کیا ہوگا۔ وَاِنَّھَا لَجَنَّۃُ الْاَبَدِ اَوْ لَنَارُ الْاَبَدِ، یا ہے ہمیشہ ہمیش کے لئے جنت میں داخلہ یا ہے ہمیشہ ہمیش کے لئے دوزخ کے حوالے ہو جانا۔ یہ ہے حضورؐ کی دعوت کا انداز آپؐ کے اوّلین زمانے کے خطبات کا اسلوب۔ اس خطبہ سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ حضورؐ کی دعوت کا مرکزی نقطہ کیا تھا؟ اسلوب کیا تھا۔ کس یقین کے ساتھ آپؐ بات کر رہے تھے۔ قسمیں کھا کر اللہ تعالیٰ کی۔ یہی اسلوب اس آیت کا ہے جو ہم پڑھ رہے ہیں۔ قُلْ بَلٰی وَرَبِّیْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ

لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ۔ یہاں آپ کو کوئی منطقی دلیل نہیں ملے گی ۔ دلیل یہاں لفظ "قُلْ" ہے ۔ یہاں کافروں کے اس زعم باطل کے ردّ اور ابطال میں کہ ہم دوبارہ اٹھائے نہ جائیں گے یا اٹھائے نہ جاسکیں گے ۔ حضورؐ کو حکم ہو رہا ہے کہ آپ پورے یقین کے ساتھ، اللہ کی قسم کھا کر، اپنے اللہ کو شہادت میں پیش کرتے ہوئے کہئے کہ "لازماً ایسا ہوگا" ۔ یہاں اصل میں نبی اکرمؐ کی شخصیت کا وزن ہے بطور دلیل ۔ کون کہہ رہا ہے! کس کی بات ہے! کس کی زبان سے یہ کلمات ادا کرائے جا رہے ہیں! اس کی شخصیت کا عالم کیا ہے! اس کی صداقت اور امانت کے بارے میں رائے کیا ہے! اس کے کردار کا لوہا کس طرح منوایا جا چکا ہے! وہ شخص ہے کہ جو قسم کھا کر خبر دے رہا ہے اور پورے یقین اور محکم یقین کے ساتھ خبر دے رہا ہے ۔ یہ نہیں کہہ رہا کہ میرا گمان یہ ہے، میرا خیال یہ ہے، میری عقل یہ حکم لگاتی ہے ۔ مجھے محسوس ہوتا ہے ۔ یہ فلسفیانہ کلام نہیں ہے ۔ یہ اس ہستی کا کلام نہیں ہے جس میں شبہ کا کوئی ذرا سا بھی امکان اور شائبہ موجود ہو ۔ یہ کلام اللہ کا کلام ہے جو وہ اپنے رسول، اپنے نبی کی زبان سے ادا کر رہا ہے اور وہ رسول اس یقین و ایقان کے ساتھ کہہ رہا ہے کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے اس کا دیکھا ہوا ہے اور واقعتاً نبوت و رسالت اسی چیز کا نام ہے کہ اس کائنات کے بہت سے حجابات اس کے لئے اٹھائے جاتے ہیں ۔ حقائق کی سیر کرائی جاتی ہے ۔ عالم غیب پر مطلع کیا جاتا ہے ۔ "عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ" تو معلوم ہوا کہ یہاں اگرچہ کوئی منطقی دلیل نہیں ہے ۔ لیکن یہ بھی نہیں ہے کہ سرے سے کوئی دلیل ہی نہ ہو ۔ درحقیقت یہاں جو دلیل مضمر ہے، وہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کی شخصیت ہے ۔ آپ لوگوں نے سیرت کے مطالعہ کے دوران یہ بات پڑھی ہوگی کہ حضورؐ نے کوہ صفا پر جو پہلا دعوتی اور تبلیغی خطبہ دیا ہے تو پہلے لوگوں سے یہ دریافت فرمایا کہ تم نے مجھے کیسا پایا ہے ۔ اپنی اس صداقت، امانت اور دیانت کی پہلے ان سے تصدیق و توثیق کرائی، جو معاشرہ تسلیم کر چکا تھا جس شخص نے کبھی جھوٹ نہ بولا ہو، جس کا شعار ہی سچ اور صدق ہو، جس نے کبھی کسی کو دھوکا اور فریب نہیں دیا ۔ تو جس نے کبھی دنیا کے کسی معاملہ میں جھوٹ نہ بولا ہو، کسی کو دھوکا نہ دیا ہو، کیا وہ خدا پر جھوٹ باندھنے لگ جائے گا ۔ کیا وہ نوع انسانی کو فریب دینے کے لئے آمادہ ہو جائے گا! پس حضورؐ کی یہی سیرت و کردار اور یہی اسوۂ حسنہ یہاں پس منظر میں بطور دلیل پنہاں ہے ۔ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ؕ وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝ یہاں ساتویں آیت ختم ہوئی اور بعث بعد الموت کا ایک خاص اسلوب سے بیان ہوگیا ۔۔۔ یہاں تک تینوں ایمانیات آ گئے

توحید - رسالت اور معاد - اب ذرا ترتیب پر نگاہ باز گشت ڈالئے - توحید پر چار آیتیں، رسالت پر دو آیتیں اور معاد پر ایک آیت - ایک ترتیب اُتری ہے۔ اس ترتیب کے حوالے سے ایک بات ذہن نشین کر لیجئے کہ نظری اور فکری نقطۂ نظر کا جہاں تک تعلق ہے - اصل ایمان ہے ایمان باللہ - ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرۃ - دونوں درحقیقت ایمان باللہ ہی کی فروع ہیں - اس کی شاخیں ہیں، جڑ جو ہے وہ ایمان باللہ ہے - اس کی شہادت میں ایمان مجمل اور ایمان مفصل سے دیتا ہوں جو امید ہے کہ آپ میں سے ہر ایک کو یاد ہوگا - ایمان مجمل میں صرف ایمان باللہ کا ذکر ہے " اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ کَمَا ھُوَ بِاَسْمَائِہٖ وَصِفَاتِہٖ وَقَبِلْتُ جَمِیْعَ اَحْکَامِہٖ - اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَتَصْدِیْقٌ بِالْقَلْبِ

ایمان مکمل ہو گیا - اس میں نہ رسالت کا، نہ ملائکہ کا، نہ آخرت کا، نہ بعث بعد الموت کا، نہ کتابوں کا، نہ جنت و دوزخ کا، نہ قضاء و قدر کا، ان میں سے کسی بات کا کوئی ذکر نہیں - اسی اجمال کی تفصیل ہے جو ایمان مفصل میں بیان کی گئی ہے - اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ - گویا اسی ایمان باللہ کی تفسیر و تشریح ہے - یہ نقشہ ذہن میں ہو تو یہ سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی کہ اصل ایمان - ایمان باللہ ہے - ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرۃ دونوں اس کی فروع ہیں - اسی کے یہ متعلقات ہیں شاخیں ہیں __________ اسی ایک جڑ سے نکلی ہیں - لیکن قانونی اور عملی اعتبار سے اصل ایمان ہے " ایمان بالرسالت - اس لئے کہ ایمان بالآخرۃ بھی وہی معتبر ہوگا جو ان تفاصیل کے ساتھ ہو، جن کی خبر ہمیں رسالت کے واسطے سے ملی ہو اور ایمان باللہ بھی وہی معتبر ہوگا جو ان اسماء و صفات کے ساتھ ہو جس کی خبر ہمیں رسالت کے ذریعے ملی ہو - یہ مختلف تقسیمیں اعتبارات کے لحاظ سے آخر میں مل جل جاتی ہیں - نظری و فکری اعتبار سے اصل جڑ ایمان کی، ایمان باللہ - قانونی اور عملی اعتبار سے اصل ایمان، ایمان بالرسالۃ، اور عمل کو درست رکھنے کے لئے، تازیانۂ عمل کے طور پر اصل ایمان، ایمان بالآخرۃ ہے اگر ایمان باللہ بھی ہے اور ایمان بالرسالۃ بھی ہے تو صحیح ایمان ہے - لیکن اگر ایمان بالآخرۃ میں کوئی گھپلا کر دیا گیا ہے - جیسے ہمارے ہاں عقیدۂ شفاعت کی غلط تفسیر و شرح اور غلط تصور سے گھپلا ہو گیا ہے کہ آخرت کے ماننے والے اور مقر تو سب ہی ہیں لیکن آخرت کا ڈر اور خوف کسی کو نہیں - ڈر کاہے کا - میاں بیٹے کوتوال ڈر کاہے کا - جب وہاں سارے مراحل شفاعت کے ذریعے طے ہو جائیں

گے تو خوف کیا؟ بس اسی طرح ایمان بالآخرۃ ایک نظری سی چیز بن کر رہ گئی ہے۔ عمل کے لئے اس میں کوئی محرک اور تازیانہ نہیں ہے۔ کوئی محرک موجود نہیں کہ حرام سے بچیں تو کیوں بچیں اگر حرام سے زیادہ مل سکتا ہے تو حاصل کرو، وہاں شفاعت موجود ہی ہے۔ وہاں تو ہمارے لئے خدا کی مغفرت پہلے سے محفوظ اور طے شدہ ہے ـــــ بس معلوم ہوا کہ عمل کو درست رکھنے والی چیز اگر کوئی ہے تو وہ آخرت کا صحیح ایمان ہے۔ ورنہ یہ سارے ایمان دھرے رہ جائیں گے اور عمل میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوگی۔ تو یہ مختلف پہلو ہیں، جن کے اعتبار سے ایمان کے جو اجتماعی تقاضے ہیں وہ باہم مربوط ہو جاتے ہیں اور ایک وحدت بن جاتے ہیں۔ ان ایمانیات کو اختصار سے بیان کرنے کے بعد اب ایمان کی براہِ راست دعوت دی جا رہی ہے۔ چنانچہ آٹھویں آیت پڑھئے جو دعوتِ ایمانیات ثلاثہ پر مشتمل ہے۔ یہاں آپ دیکھیں گے کہ اگلی دو آیتوں (۹، ۱۰) میں سب سے زیادہ زور ایمان بالآخرۃ پر ہے۔ چونکہ درحقیقت یہی ایمان بالآخرۃ ہے جو عمل کو درست رکھنے کی کلید ہے۔ فرمایا "فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِیْٓ اَنْزَلْنَا ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ۝" پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اس نور پر کہ جو ہم نے نازل کیا۔ یعنی یہ قرآن مجید، کلام اللہ الحمید۔ اور جان لو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے باخبر ہے"۔ وہ جزئیات سے بھی واقف ہے، محض کلیات کے مغالطہ میں نہ رہ جانا "لَا یُغَادِرُ صَغِیْرَةً وَّلَا كَبِیْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا" وہی بات جو سورۃ لقمان کے دوسرے رکوع کے دروس میں بھی بیان ہوئی تھی۔ "یٰبُنَیَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِیْ صَخْرَةٍ اَوْ فِی السَّمٰوٰتِ اَوْ فِی الْاَرْضِ یَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِیْفٌ خَبِیْرٌ ۝ ـــــ اب نویں آیت لیجئے۔ فرمایا "یَوْمَ یَجْمَعُكُمْ لِیَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ یَوْمُ التَّغَابُنِ ؕ" اب پھر ایمان بالآخرۃ کی بات ہو رہی ہے۔ دعوتِ ایمانی میں ایمان باللہ مقدم۔ ایمان بالرسالت اس کے بعد، جیسے فرمایا "فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ اس کے بعد "وَالنُّوْرِ الَّذِیْٓ اَنْزَلْنَا"۔ پر ایمان کی دعوت۔ رسول اور کتاب دونوں پر مل کر ایمان بالرسالہ کی تکمیل ہوتی ہے۔ چونکہ کتاب رسول ہی لے کر آتے ہیں۔ پھر اب تیسرے ایمان یعنی ایمان بالآخرۃ کا بیان ہوا۔ "وہ دن کہ جس دن وہ تمہیں جمع کرے گا، جمع کرنے کے دن، وہ دن ہے ہار جیت کے فیصلے کا" تغابن کے لفظ کے بارے میں جان لیجئے کہ یہ بابِ تفاعل کا مصدر ہے اور اس کا مادہ لفظ "غبن" ہے۔ یہ ہمارے ہاں بھی مستعمل ہے، کسی کو نقصان

پہنچانا، کسی کا مال دبالینا۔ مالک کی اجازت کے بغیر اس کے مال میں تصرف کرلینا، یہ غبن ہے۔ باب تفاعل میں تغابن اسی کیفیت کو پیش کر رہا ہے کہ یہاں دنیا میں جو باہم معاملات ہوتے ہیں ان میں ہر فریق یہ چاہتا ہے کہ وہ دوسرے سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرے۔ آپ دوکاندار کے پاس گئے اور اس سے مول تول کیا، تو مول تول کی جو ساری کشمکش آپ کے اور دوکاندار کے مابین ہوگی، اس کا مفاد یہ ہوگا کہ دوکاندار آپ سے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنا چاہے گا اور آپ یہ چاہیں گے کہ زیادہ سے زیادہ منفعت مجھے حاصل ہو جائے۔ پس حصولِ نفع اور مسابقت کی اس کشمکش کا نام ہے تَغَابُن۔ ہار جیت یا نفع و نقصان میں رہنے کی یا مسابقت کی جو کشمکش ہوئی تو یہ تغابن ہے۔ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ط اسی میں اس روز کھلے گا کہ کون جیتا اور کون ہارا؟ کون کامیاب رہا، کون ناکام ہوا؟ بظاہر ابوجہل اس وقت بڑا کامیاب ہے، جب چاہا اس نے ایک برچھا مارا اور حضرت سمیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو ہلاک کر دیا، ایک اور برچھا مارا اور حضرت یاسرؓ کو ہلاک کر دیا۔ اس کی قوت کا، اس کی شان و شوکت، اس کے دبدبہ کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ سب سے بڑا پڑاؤ وہ کہتا تھا کہ میرا ہی ہے، میری ہی چوپال میں سب سے زیادہ لوگ بیٹھتے ہیں۔ میری پارٹی سب سے بڑی ہے۔ میرا جتھا سب سے بڑا ہے لیکن اصل میں تو وہاں جا کر کھلے گا کہ کون کیا تھا؟ کس کی کیا حقیقت تھی! کون کتنے پانی میں تھا۔ کس کے پاس واقعتاً قوت تھی۔ کون کتنا اثاثہ لے کر آیا۔ کون بامراد ہوا اور کون نامراد ہوا؟ ہار کس کی ہوئی اور جیت کس کی! اس دنیا کی ہار جیت، کامیابی اور ناکامی، مسابقت و منقبت فانی ہے۔ اس کا وہاں کوئی وزن نہیں ہوگا، کوئی قدر و قیمت نہیں ہوگی۔ یہاں کا نفع و نقصان وہاں بے کار محض ہوگا۔ اصل تختہ اور باقی Balance Sheet وہاں پیش ہوگی۔ يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ط وہ دن کہ جس دن وہ تمہیں جمع کرے گا، جمع کرنے کے دن۔ وہ ہے ہار جیت کے فیصلے کا دن، اور وہ ہار جیت کیا ہے؟ اس کی تفصیل کیا ہے؟ اسے آگے بیان کیا گیا۔ فرمایا: وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ "جو یہاں دنیا میں خدا پر ایمان رکھے گا، پختہ یقین کے ساتھ رکھے گا اور عمل کرے گا درست۔ تو اللہ تعالیٰ اس سے اس کی برائیوں کو دور فرما دے گا۔ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا ط اور داخل کرے گا انہیں ان باغات میں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی، ان

باغات میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ یہی ہے بڑی کامیابی، اصل کامیابی، اور یہی ہے اصل جیت ـــــ اور اس کے برعکس وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ۔ جنہوں نے ناقدری کی اس نبوت کی، رسالت کی، قرآن کی۔ انکار کیا خدا کا، حضورؐ کا، قیامت کا اور تکذیب کی ہماری آیات کی، جھٹلایا ہماری نشانیوں کو ـــــ یہاں ایک بات اور ذہن نشین کر لیجئے کہ قرآن مجید میں جہاں کفر اور تکذیب دونوں ساتھ ساتھ آتے ہیں، ان دونوں جرائم کا ساتھ ساتھ ذکر ہوتا ہے تو کفر کی ابتدائی منزل یہ ہے کہ اللہ کے وجود کی جو شہادتیں انسان کی اپنی فطرت اور اپنے باطن میں مضمر ہیں، انسان ان کو دبا دے، چھپا دے، ان کی قدر نہ کرے، یہ اصلِ کفر ہے۔ اور تکذیب اس کے اوپر دوسرا ظلم ہے کہ جب رسول آئے، کتاب اتری، آیاتِ الٰہی نے ان کی فطرت اور ان کے باطن کی شہادتوں کے اندر ایک نئی زندگی پیدا کی، ان کو اجاگر کیا، اس کو حقیقت نفس الامری کی طرف از سرِ نو متوجہ کیا تو اسے جھٹلا دیا۔ فطرت اور باطن کی شہادتوں کو دبا دیا اور نبی کی تعلیم کو جھٹلا دیا۔ تو یہ دو جرم ہو گئے۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا "کفر اور تکذیب ہم معنی نہیں ہیں بلکہ جرم کے دو علیحدہ علیحدہ پہلو ہیں ـــــ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ یہ لوگ ہیں آگ والے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔" وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ "اور وہ کیا ہی برا ٹھکانہ ہے"۔ یہ ہے اصل ہار جیت، یہ ہے حقیقی ناکامی اور نامرادی۔ ابھی میں نے حضورؐ کا جو خطبہ آپ کو سنایا تھا کہ وَاِنَّهَا لَجَنَّةٌ اَبَدًا اَوْ لَنَارٌ اَبَدًا ؕ وہی بات یہاں فرمائی گئی کہ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ یہ جہنم بہت ہی بری جگہ ہے۔ جہاں انسان پہنچ جائے۔ یہاں وہ دعوتِ ایمانی ختم ہو گئی جو آٹھویں آیت سے شروع ہوئی تھی اور پہلا رکوع بھی ختم ہو گیا۔ (باقی آئندہ)

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافہ اور تبلیغ کے لیے اشاعت کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقہ کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

فکرِ مغرب کی اساس اور اس کا تاریخی پس منظر

از قلم: پروفیسر یوسف سلیم چشتی

پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم و مغفور کا مندرجہ ذیل مضمون بظاہر تو ایک خط ہے جو موصوف نے برادرِ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے اس مضمون کی تحسین اور تائید کے لیے لکھا تھا جو جون ۱۹۶۷ء کے 'میثاق' میں "تذکرہ و تبصرہ" کے عنوان کے تحت شائع ہوا تھا لیکن اس نے یورپ کے فلسفہ و فکر کے تاریخی ارتقاء کے موضوع پر ایک جامع اور مبسوط مقالے کی صورت اختیار کر لی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انتہائی اختصار اور کمال جامعیت کے امتزاج کے اعتبار سے یہ تحریر اپنی مثال آپ ہے۔ کاش کہ پروفیسر صاحب کی بعض دوسری ناگزیر مصروفیات نے موصوف کو مہلت دی ہوتی اور وہ اس موضوع پر زیادہ تفصیل سے لکھ سکتے تو فلسفۂ جدید کے طالب علموں کی رہنمائی کا ایک مستقل سامان ہو جاتا۔ بحالتِ موجودہ بھی ہمیں یقین ہے کہ یہ تحریر فلسفۂ جدید کے بہت سے طالب علموں کے لئے انتہائی مفید ثابت ہوگی۔ پروفیسر صاحب کی یہ تحریر بھی اولاً "میثاق" کی دسمبر ۶۷ء اور جنوری ۶۸ء کی اشاعتوں میں شائع ہوئی تھی۔ بعد ازاں جب وہ مقالہ "دارالاشاعت الاسلامیہ" کے تحت "اسلام کی نشاۃِ ثانیہ: کرنے کا اصل کام" کے عنوان سے شائع ہوا تو پروفیسر صاحب کی اس تحریر کو بھی اس کے ساتھ شامل کر دیا گیا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا

عبدالماجد دریابادی مرحوم و مغفور نے 'صدق جدید' کی اشاعت بابت ، فروری [illegible]ء میں تحریر فرمایا تھا۔

"دونوں مقالے ماہنامہ 'میثاق' لاہور میں قسط وار نکل چکے ہیں۔
دونوں کا موضوع نام سے ظاہر ہے ، دونوں فکر انگیز ہیں۔ اور ایک
طرف جوش و اخلاص اور دوسری طرف دانش و باریک بینی کے
مظہر ہیں۔ مرض کی تشخیص اور تدبیرِ علاج دونوں میں دیدہ ریزی سے
کام لیا گیا ہے ـــــ رسالہ ہر پڑھے لکھے کے ہاتھ میں جانے کے قابل ہے"

بعد میں جب "مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور" کے زیرِ اہتمام "اسلام کی نشاۃ ثانیہ" کے دو بعد ایڈیشن شائع ہوئے تو کچھ کفایت کے پیشِ نظر اور کچھ ـــــ اس بنا پر کہ اس میں برادرِ محترم کے لئے بہت تحسین آمیز الفاظ استعمال ہوئے تھے پروفیسر صاحب کی یہ تحریر شاملِ اشاعت نہ کی گئی۔

خود راقم کو ان دونوں تحریروں سے ایک نہایت قریبی ذہنی اور قلبی لگاؤ رہا ہے۔ چنانچہ جب راقم فلسفے میں ڈاکٹریٹ کی تکمیل کے لئے انگلستان گیا تو راقم کو اچھی طرح یاد ہے کہ وہاں پہلے ایک سال ہی کے دوران راقم نے برادرِ محترم کی اُس تحریر کو چھ بار پڑھا تھا ـــــ اور اب احساس ہوتا ہے کہ انگلستان کی فضا ، بالخصوص یونیورسٹیوں میں الحاد و مادہ پرستی کا خصوصاً اس دور میں جو شدید تسلط تھا اس سے حفاظت میں جہاں اصل فضل تو اللہ کا ہے وہاں عالمِ واقعہ میں برادرِ محترم اور چشتی صاحب کی ان تحریروں کو بہت دخل حاصل ہے ۔

پروفیسر چشتی صاحب کی یہ تحریر ۱۹۷۵ء میں 'میثاق' میں دوبارہ شائع ہوئی تھی اور اب تیسری بار 'حکمتِ قرآن' میں شائع کی جا رہی ہے۔ اس لئے کہ اُس وقت 'میثاق' کا حلقہ بہت محدود تھا ـــــ ان شاء اللہ ، 'حکمتِ قرآن' کے نئے قارئین کے لئے یہ تحریر نہایت دلچسپی اور معلومات میں اضافہ کا موجب ہوگی ۔

خاکسار ،

ڈاکٹر ابصار احمد

برادرم عزیزم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

میثاق ماہ جون ۱۹۶۷ء میں جو خیالات آپ نے تحت "تذکرہ وتبصرہ" سپرد قلم کئے ہیں ان کو پڑھ کر خوشی بھی ہوئی اور آپ کے لیے تہ دل سے دُعا بھی نکلی۔ آپ نے عصرِ حاضر پر جو تبصرہ کیا ہے وہ صحیح ہے۔ اہلِ مغرب کا ملحدانہ زاویۂ نگاہ، اس زاویۂ نگاہ کا اہلِ مشرق کے ذہنوں پر تسلّط، اس کے مضر نتائج، اس ناگوار صورتِ حال سے رہائی کی تجویز اور اصلاحِ حال کی راہ۔ ان مباحث پر جو کچھ آپ نے لکھا ہے وہ بلاشبہ آپ کی اصابتِ فکر و رائے، معاملہ فہمی، ژرف نگاہی اور حقائق رسی کا واضح ثبوت ہے۔ میں آپ کو صدقِ دل سے مبارکباد دیتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ نے آپ کو جوانی میں بوڑھوں کی سی سمجھ عطا فرمائی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے مسلمانوں کی دینی اصلاح کی کسی خدمت کے لیے آپ کو منتخب کر لیا ہے اور میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ آپ کو خدمتِ دین کی بیش از بیش توفیق بھی عطا فرمائے۔

میں نے بھی نصف صدی تک (از ۱۹۱۷ء تا ایندم) انہی دو تین مسائل پر غور کیا ہے۔ یعنی مغرب میں الحاد اور مادّیت کے فروغ کے اسباب، ان مغربی افکار کا اقوامِ مشرق کے ذہنوں پر تسلّط اور اس تسلّط سے رہائی کی صورت۔ مجھے آپ کا مضمون پڑھ کر جو غیر معمولی مسرّت حاصل ہوئی ہے اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ میرے نتائجِ افکار اور آپ کے نتائجِ افکار میں حیرت انگیز مطابقت پائی جاتی ہے۔ میری رائے میں آپ کی خدمت میں ہدیۂ تحسین پیش کرنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ میں آپ کے بعض دعاوی کو مبرہن اور مدلّل کر دوں، بعض حقائق کی وضاحت کر دوں، بعض صداقتوں کو مؤکّد کر دوں اور بعض تجاویز کو مشیّد کر دوں۔

۱۔ آپ نے لکھا ہے:

"موجودہ دَور بجا طور پر مغربی فلسفہ و فکر اور علوم و فنون کی بالادستی کا دَور ہے اور آج پورے کرۂ ارض پر مغربی افکار و نظریات اور انسان اور کائنات کے بارے میں وہ تصوّرات پوری طرح چھائے ہوئے ہیں جن

کی ابتدا آج سے دو سَو سال قبل یورپ میں ہوئی تھی" نیز یہ کہ " مغربی
تہذیب و تمدّن اور فلسفہ و فکر کا یہ تسلّط بہت شدید اور ہمہ گیر ہے۔"

آپ کا یہ تبصرہ بالکل صحیح ہے چنانچہ میرے اور علّامہ اقبالؒ دونوں کے معنوی مرشد، لسان العصر اکبر الہٰ آبادی نے آج سے پچاس سال پہلے انہی حقائق کو اپنے مخصوص ظریفانہ انداز میں یوں بیان کر دیا تھا:۔

مرزا غریب چُپ ہیں ان کی کتاب رَدّی
بُدّھو اکڑ رہے ہیں" صاحب نے یہ کہا ہے"

اور :- چیز وہ ہے بنے جو یورپ میں
بات وہ ہے جو پانیر میں چھپے

۲۔ آپ نے لکھا ہے :۔

" لیکن اس پورے ذہنی اور فکری سفر کے دوران ایک نقطۂ نظر جو مسلسل پختہ ہوتا چلا گیا اور جسے بجا طور پر اس پورے فکر کی اساس قرار دیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں خیالی اور ماورائی تصورات کے بجائے ٹھوس حقائق کو غور و فکر کا اصل مرکز ہونے کی حیثیت حاصل ہے اور خدا کے بجائے کائنات، روح کے بجائے مادّہ اور موت کے بعد کسی زندگی کے تصوّر کے بجائے حیاتِ دنیوی کو اصل موضوعِ بحث قرار دیا گیا ہے۔"

یہ جو کچھ آپ نے لکھا ہے۔ حرف بحرف صحیح ہے۔ آج مغرب شدید نوعیت کے الحاد اور انکارِ خدا کی لعنت میں گرفتار ہے چنانچہ آج مغرب میں منطقی ایجابیت ——— (LOGICAL POSITIVISM) کا فلسفہ سب سے زیادہ مقبول ہے اور اس کے علاوہ جو مدارسِ فکر مقبول ہیں وہ بھی سب کے سب انکارِ خدا و روح و آخرت پر مبنی ہیں اور خالص مادّیت کے حامی اور مبلّغ ہیں۔ مثلاً:۔

۱) "THE PHILOSOPHY OF "AS IF جس کا سب سے پُرجوش حامی اور وکیل VAIHINGER ہے
۲) PHENOMENALISM 〃 〃 〃 HUSSREL

(ج) DIALECTICAL MATERIALISM جس کا سب سے پُرجوش حامی اور مبلغ MARX

(د) NATURALISM " " " SANTAYANA

(ہ) AGNOSTICISM AND SCEPTICISM " " " " J S MILL

(و) EMERGENT EVOLUTION " " " LOYD MORGAN

(ز) ATHEISM " " " MORRIS COHEN

(ح) HUMANISM " " " " SCHILLER

(ط) REALISM " " " " MOORE

(ی) PRAGMATISM " " " " DEWY

(ک) LOGICAL EMPIRICISM " " " " CARNAP

(ل) EXISTENTIALISM " JEAN P SARTRE

(م) FREUDISM " " " " FREUD

(ن) BEHAVIOURISM " " " " ADLER

(س) COMMUNISM " " " " LENIN

(ع) SOCIALISM " " " " LASKI

(ف) LOGICAL ATOMISM " " " " RUSSELL

(ص) PHYSICAL REALISM " " " " SELLARS

ان تمام مدارسِ فکر میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ جو شے حواسِ خمسہ سے محسوس نہ ہو اس کے وجود پر یقین کرنا سراسر حماقت ہے۔ چونکہ خدا، روح اور حیات بعد الموت تینوں غیر محسوس ہیں۔ اس لیے ان کی ہستی پر یقین خلافِ عقل ہے بلکہ یہ تینوں الفاظ مہمل ہیں کیونکہ ان کے مصادیق خارج میں کہیں موجود نہیں ہیں۔

یورپ میں لامذہبیت اور انکارِ خدا کے اسباب کی داستان بہت طویل ہے۔ جن حضرات کو اس موضوع سے دلچسپی ہو انہیں حسبِ ذیل کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے:-

1. CONFLICT BETWEEN RELIGION & SCIENCE By DR. DRAPER.

2. HISTORY OF THE INTELLECTUAL DEVELOPMENT OF EUROPE By DR. DRAPER.

3. HISTORY OF THE WARFARE BETWEEN SCIENCE & THEOLOGY By WHITE

4. HISTORY OF EUROPEAN MORALS By DR LECKY.

5. HISTORY OF FREE THOUGHT IN EUROPE By ROBERTSON.

تاہم قارئین کی خاطر ذیل میں اجمالی طور پر کچھ اشارات درج کیے دیتا ہوں۔

(ا) جب (JUSTINIAN) قیصر روم نے یہ دیکھا کہ حکمائے یونان نصرانیت کے خلاف حق عقائد پر فلسفیانہ اعتراضات کرتے رہتے ہیں تو اس نے تنگ آکر ۵۲۹ء میں اپنی قلمرو میں فلسفہ اور حکمت کی تعلیم کو ممنوع قرار دے دیا اور تمام فلاسفہ اور حکماء کو جلا وطن کر دیا۔

(ب) اغیار کی طرف سے مطمئن ہو جانے کے بعد نصرانیوں کی زبان بندی اور ذہنی غلامی کے لیے کلیسائے روم کے اساقفِ اعظم (POPES) نے یہ قانون نافذ کیا کہ جو عیسائی کسی مذہبی عقیدے یا کسی کلیسائی فرمان پر اعتراض کرے گا، اسے کلیسا سے بھی خارج کر دیا جائے گا اور ملعون قرار دے دیا جائے گا۔ یعنی جیسے چھوت چھات اور ہندو قوم کا لاشہ بے گور و کفن؟

(ج) اجانب اور اقارب دونوں کی طرف سے بے فکر ہو جانے کے بعد کلیسائے روم نے خلافِ حق عقائد[1] (DOGMAS) کے ساتھ حسبِ ذیل احکام واجب الاذعان بھی

---

[1] مثلاً، تثلیث جس کی رو سے خدا ایک وقت و بیک جہت (باقی اگلے صفحہ کے نیچے)

نافذ کر دیئے :۔

۱۔ معیارِ حق و باطل بائبل نہیں ہے بلکہ کلیسا ہے اور کلیسا سے مراد ہے پوپ اور اس کے ماتحت مذہبی پیشواؤں کی جماعت ۔

۲۔ ہر پوپ معصوم عن الخطاء اور مطاع ہے اس لیے اس کے احکام میں چون و چرا کی گنجائش نہیں ہے ۔

۳۔ مذہب اور مذہبی عقائد میں عقل کو مطلق دخل نہیں ہے ۔

بجا کہے جسے پاپا، اسے بجا سمجھو
زبان پوپ کو نقارۂ خدا سمجھو!

۴۔ کلیسائی روایات کا انکار بھی کفر ہے ۔

و بیک حیثیت و بیک اعتبار ایک بھی ہے اور تین بھی ہے نیز وحدت بھی حقیقی ہے اور تثلیث بھی حقیقی ہے ۔

(ب) تجسّم جس کی رو سے کلام (LOGOS) جو خدا کے ساتھ بھی ہے اور خدا بھی ہے، مجسّم ہو کر یسوع کی شکل میں ظاہر ہوا۔

(ج) یسوع نے ، اگرچہ وہ خدا تھا اور خدا کی صورت میں تھا، بوجہ غایت فروتنی (HUMILITY) اپنے آپ کو الوہیت سے معرّیٰ کر دیا اور غلام کی حیثیت اختیار کر لی اور صلیبی موت گوارا کر لی ۔

(د) یسوع مسیح نے مصلوب ہو کر قیامت تک پیدا ہونے والے انسانوں کے پیدائشی گناہوں کا کفّارہ ادا کر دیا ۔

(ہ) جب پادری، عشاء ربانی کے وقت روٹی اور شراب پر یسوع کا نام لے کر دعا کرتا ہے اور اسے اپنے ہاتھ سے متبرک کر دیتا ہے تو وہ روٹی یسوع کا جسم اور شراب یسوع کا خون بن جاتی ہے ۔ اس ناقابلِ فہم عمل کو اصطلاح میں (TRANSUBSTANTIATION) کہتے ہیں اردو میں اس کا ترجمہ ہوگا استحالۂ جوہری یا انقلابِ ذات ۔

۵۔ پوپ اور کلیسا کو گناہ معاف کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

۶۔ کلیسا کے علاوہ کسی شخص کو بائبل لکھنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

(۷) تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی میں اندلس کے مشہور فلسفی ابن رشد (متوفی ۱۱۹۸ء) کی تمام تصانیف کا ترجمہ لاطینی زبان میں ہوگیا اور پندرھویں صدی میں اس کی تمام تصانیف اٹلی اور فرانس کی یونیورسٹیوں کے نصاب تعلیم میں شامل ہوگئیں۔ ان تصانیف کی بدولت یورپ ایک ہزار سال کے بعد ارسطو کے فلسفے سے واقف ہوا اور اس کی وجہ سے یورپ میں سولہویں صدی میں دو تحریکیں رونما ہوئیں جن کا نام "احیاء العلوم" اور "اصلاح کلیسا" ہے۔ چنانچہ رومن کیتھولک کلیسا، جس کے خلاف لوتھر نے صدائے احتجاج بلند کی اس بات کا معترف ہے کہ لوتھر بڑی حد تک ابن رشد کے فلسفے سے متاثر ہوا تھا۔ میری تحقیق بھی یہی ہے کہ لوتھر کے دماغ میں کلیسا کی اصلاح کا خیال ابن رشد کی تصانیف کے مطالعے سے پیدا ہوا تھا۔

قصہ مختصر سولہویں صدی میں حسب ذیل پادریوں نے جو رومی کلیسا سے وابستہ تھے، کلیسا کی چیرہ دستیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی (ERASMUS) م ۱۵۳۶ء (ZIVINCLI) م ۱۵۳۱ء (LUTHER) م ۱۵۴۶ء (MCLANCTHON) م ۱۵۶۱ء اور CALVIN م ۱۵۶۴ء۔ ان کا سربراہ لوتھر تھا اس نے یہ اعلان کیا کہ بائبل کی صداقت کا دارومدار کلیسا پر نہیں ہے (جیسا کہ کلیسا کہتی تھی) بلکہ خود کلیسا کی صداقت کا دارومدار بائبل پر ہے یعنی معیار حق و صداقت بائبل ہے نہ کہ پوپ یا کلیسا۔

لوتھر اور اس کے ہمنواؤں کے احتجاج (PROTEST) کا نتیجہ یہ نکلا کہ رومن کیتھولک مذہب کے مقابلے میں یورپ میں پراٹسٹنٹ مذہب پیدا ہوگیا اور کلیسا کا اقتدار بڑی حد تک ختم ہوگیا۔

تحریک احیاء العلوم کی بدولت یورپ میں فلسفے (خصوصاً فلسفۂ ارسطو) کے مطالعے کا ذوق از سر نو زندہ ہوگیا اور جب اس کی بدولت یورپ کو عقلی آزادی نصیب ہوئی تو سترھویں صدی میں سائنس کا دور شروع ہوا جو آجکل بیسویں صدی میں اپنے

نقطۂ عروج کو پہنچا ہوا ہے۔

(د) اہلِ سائنس اور اہلِ فلسفہ دونوں نے کلیسائیت اور نصرانیت کے خلاف عقلی عقائد پر اعتراضات وارد کئے۔ کلیسا اور نصرانیت دونوں ان کے جوابات سے قاصر اور عاجز تھیں۔ اس لیے انہوں نے معترضین کو کلیسا اور مذہب دونوں سے خارج کر دیا۔

کلیسا سے دوسری غلطی یہ ہوئی کہ اس نے سائنس کی تحقیقات کو بھی مذہب کے خلاف قرار دے دیا مثلاً جب کاپرنیکس اور گلیلیو نے یہ کہا کہ زمین گول ہے اور آفتاب کے گرد گھوم رہی ہے تو کلیسا نے کہا یہ باتیں مذہب کے خلاف ہیں اور ان کے قائلین کافر ہیں

(ہ) کلیسا کی عقل دشمنی کا نتیجہ یہ نکلا کہ سائنس اور مذہب میں جنگ شروع ہو گئی اور اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ حکما اور فلاسفہ نے مذہب کو خیرباد کہہ دیا اور اس طرح یورپ میں لامذہبیت کا آغاز ہو گیا۔

اٹھارہویں صدی کے نصفِ اوّل میں (HUME) نے لا ادریت کا فلسفہ پیش کیا اور عقلی دلائل سے ثابت کیا کہ عقلِ انسانی، خدا کی ہستی کا اثبات نہیں کر سکتی۔ ہیوم کے اس فلسفے کو کانٹ (KANT) نے ۱۷۸۱ء میں پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا اور اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "تنقیدِ عقلِ خالص" میں خدا کی ہستی پر جو دلائل فلاسفہ نے مدون کئے تھے، ان سب کا ابطال کر دیا، اور اس طرح انکارِ خدا کی راہ ہموار کر دی۔

انیسویں صدی میں مشہور منطقی سر ولیم ہیملٹن اور مشہور عالم الٰہیات ڈاکٹر مینسل نے ہیوم اور کانٹ کے نظریات کی یہ کہہ کر مزید تائید کر دی کہ ذہنِ انسانی خدا کے بارے میں کچھ نہیں جان سکتا۔ ان کے بعد مِل اور اسپنسر نے اپنے فلسفۂ لا ادریت سے مذکورہ بالا حکماء کے نظریات کو تقویت پہنچائی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انکارِ خدا کا عقیدہ خواص اور عوام دونوں کے دماغوں میں جاگزیں ہو گیا۔

جب یورپ کو کلیسا اور پوپ کی غلامی سے نجات ملی تو حکما اور فلاسفہ نے نفسِ مذہب کے ساتھ ساتھ نصرانیت اور کلیسائی عقائد کو بھی ہدفِ تنقید بنایا اور انیسویں صدی میں ان کی تنقید اپنے انتہائی عروج کو پہنچ گئی۔ چنانچہ اس صدی کے نصفِ اوّل میں مشہور

جرمن فاضل اور محقق اسٹراس (STRAUSS 1808-1874) نے ۱۸۳۵ء میں حیات یسوع (LEBANJESU) لکھ کر کلیسا کے ایوان میں زلزلہ ڈال دیا۔ اس غیر فانی کتاب میں اس نے اس بات کو مبرہن کیا کہ یسوع کی شخصیت تاریخی طور پہ ثابت نہیں ہو سکتی نیز یہ کہ یسوع تو قدیم دیوتا متھرا کا مثنیٰ ہے اور جو مذہب اس کے نام سے منسوب ہے وہ متھرائیت کا چربہ ہے۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر واکر پروفیسر تاریخ کلیسا نے اپنی تصنیف تاریخ کلیسا میں اس کتاب کو THE MOST EPOCH-MAKING BOOK عظیم ترین عہد آفریں کتاب قرار دیا ہے۔

۱۸۴۱ء میں ہیگل کے مشہور شاگرد فیور باخ (م ۱۸۷۲ء) نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "THE ESSENCE OF CHRISTIANITY" شائع کی جس میں اس نے عیسائی مذہب اور اس کے تصورِ ذات باری دونوں کا ابطال کر دیا۔

۱۸۶۳ء میں فرنچ فاضل ارنسٹ رینان (م ۱۸۹۲ء) نے حیات یسوع (VIE DE JESUS) لکھی جس میں اس نے یہ ثابت کیا کہ یسوع محض ایک انسان تھا۔

پروفیسر بور (F C BAUR) نے بائبل کی کتابوں پر تنقید کی اور ثابت کیا کہ پولوس کے خطوط میں سے صرف تین اصلی ہیں باقی سب جعلی ہیں اس لیے بائبل بحیثیت مجموعی قابلِ اعتماد نہیں ہے۔

(س) میں نے بخوف طوالت چند نقادوں کے تذکرے پہ اکتفا کیا ہے۔ میرا مقصد یہ دکھانا ہے کہ اس تنقید کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ پہلے مذہب عیسوی اور اس کے بعد نفس مذہب بھی پایۂ اعتبار سے ساقط ہو گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ مذہب کو اس بات سے بھی بہت ضعف پہنچا کہ یورپ میں جو فلسفہ — اور اس سے میری مراد فلسفہ تصوریت (IDEALISM) ہے، مذہب کا حامی تھا، انیسویں صدی میں اس پر چاروں طرف سے اعتراضات شروع ہو گئے اور اس کے زوال کا نتیجہ یہ نکلا کہ فلسفے کے میدان میں

مذہب کا کوئی مددگار باقی نہ رہا اس کی تفصیل یہ ہے :۔

انیسویں صدی میں کارل مارکس نے اپنے فلسفہ اشتراکیت کو مسلکِ مادّیت کی اساس پر قائم کیا جو خدا اور روح دونوں کا منکر ہے ۔

ڈارون نے نظریۂ ارتقا پیش کیا جس سے مسلک مادّیت کو تقویت حاصل ہوئی ،

شوپن ہاور نے نظریۂ قنوطیت (PESSIMISM) کی اشاعت کی اور یہ نظریہ بھی خدا اور مذہب کا مخالف ہے ۔

مل اور اسپنسر نے مسلکِ لاادریت کی تبلیغ کی اور یہ مسلک بھی مذہب اور خدا کے بارے میں شکوک پیدا کرتا ہے ۔

نطشہ (NEITZCHE) نے بھی اپنے فلسفے میں خدا کا انکار کیا اور ANTI — CHRIST لکھ کر عیسائیت پر کاری ضرب لگائی ۔

بیسویں صدی میں وجودیت (EXISTENTIALISM) اور منطقی اثباتیت (LOGICAL POSITIVISM) نے مادّیت کو تقویت پہنچائی اور جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں آج یورپ میں آخر الذکر فلسفہ سب سے زیادہ مقبول ہے جس کی رو سے خدا، روح اور آخرت تینوں الفاظ قطعاً مہمل اور بے معنی ہیں ۔

یہ سچ ہے کہ بریڈلے (م ۱۹۲۴ء) نے اپنی شہرہ آفاق کتاب مظاہر اور حقیقت "APPEARANCE & REALITY" میں مادّیت کی پورے طور سے تردید کر دی ہے ۔ چنانچہ ڈاکٹر رشید ڈل نے اپنی تصنیف "فلسفہ اور مذہب" میں میرے قول کی بایں الفاظ تائید کی ہے ۔ "مسٹر بریڈلے نے اپنی تصنیف کے ابتدائی ابواب میں مادّیت کے مقابلے میں تصوریت کی جس انداز سے حمایت کی ہے اس کی تردید نہیں ہو سکتی ۔" (صـ۲۷)

لیکن یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ عصرِ حاضر میں الحاد پرور سائنس اور ملحدانہ مدارسِ فلسفہ کو جو قبول عام کی سند حاصل ہو گئی ہے اس کی وجہ سے فلسفۂ تصوریت جو مادّے کے مقابلے میں روح کو اصل کائنات اور حقیقتِ اقصیٰ قرار دیتا ہے ، غیر مقبول ہو چکا ہے ۔ آج کی دنیا میں حکماء اور فلاسفہ کی اکثریت کا میلان مادّیت کی طرف ہے اور مذہب کی

اپیل بہت کمزور ہوگئی ہے اور سائنٹفک نظریات نے بہت سے مذاہب کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا ہے۔

عصرِ حاضر میں پانچ مدارسِ فکر بہت مقبول ہیں۔ اور سب کے سب الحاد پرور ہیں۔ اور انکارِ خدا و روح پر مبنی ہیں یعنی:۔

1. PLURALISTIC REALISM
2. DIALECTICAL MATERIALISM
3. EXISTENTIALISM
4. NATURALISM
5. LOGICAL POSITIVISM

اور ان میں آخر الذکر فلسفہ سب سے زیادہ مقبول ہے۔

خلاصۂ کلام یا رجحانِ عصرِ حاضر قصہ مختصر خدا اور مذہب کے بارے میں جو شکوک اور شبہات جدید تعلیم یافتہ طبقے کے افراد میں پائے جاتے ہیں، ان کے اسباب یہ ہیں:۔

(ا) سائنٹیفک اسپرٹ (روح) کی روز افزوں نشوونما اور آبیاری۔

(ب) ٹیکنولاجیکل تہذیب کی ترقی۔

(ج) مادی علوم و فنون کا عروج۔

(د) ایجادات کی بدولت تسخیرِ عناصرِ کائنات کا سلسلہ۔

(ہ) لذاتِ جسمانی اور ترغیباتِ جنسی کی روز افزوں فراوانی اور بوقلمی۔

ان عناصر سے انسان کا نقطۂ نظر سراسر مادی ہوگیا ہے اور اس کا اثر حیات کے ہر شعبے پر مرتب ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سائنسی فتوحات نے انسان کی نگاہوں کو خیرہ کر دیا ہے[1]

---

[1] نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے (اقبال)

خدا سے بے نیازی کی ابتداء تو کاپرنیکس ہی کے عہد سے شروع ہو چکی تھی اسی لیے لاپلاس م ۱۸۲۷ء (LAPLACE) نے نپولین کے سوال کے جواب میں یہ عہد آفریں جواب دیا تھا کہ "میں نے اپنی تصنیف 'توضیح نظام کائنات' میں خدا کا ذکر محض اس لئے نہیں کیا کہ عقل کی مدد سے کائنات کا نظام خدا کے بغیر بھی بخوبی مدون ہو سکتا ہے۔" اور اسی لیے بیسویں صدی میں اقبال کے استاد میک ٹیگرٹ[۲] (م ۱۹۲۵ء) نے جب اپنا فلسفۂ خودی — ONTOLOGICAL IDEALISM کے عسیر الفہم عنوان سے مرتب کیا تو انسانی خودی کو حقیقت (REALITY) تسلیم کرنے کے بعد خدا کو اپنے نظامِ فکر سے بکلّی خارج کر دیا۔

فزیکل سائنس ہر لمحے ہماری حیاتِ اجتماعی و انفرادی کو متاثر کر رہا ہے۔ خصوصاً ہمارے مدارس فلسفہ ہمارے مذاہب اور حیات و ممات سے متعلق ہمارے عمومی زاویۂ نگاہ پر تو نمایاں اور ناقابلِ تردید اثر مرتب ہوا ہے۔

جدید سائنس کی رو سے حیاتِ عضوی کی توجیہہ محسوس فطری قوانین کی روشنی میں کی جاتی ہے۔ اس کے لئے کسی فوق الفطرت طاقت کا سہارا نہیں لیا جاتا اور اس سائنٹفک توجیہہ کی رو سے انسان فاعل مختار (FREE MORAL AGENT) نہیں ہے۔

اسی طرح جدید نفسیات کی رو سے انسان اپنی ذات کا مالک نہیں ہے۔ نفسِ انسانی کی باشعور زندگی پر اس کی حیوانی جبلّتوں کی حکومت ہے جو اس کے لاشعور میں پوشیدہ ہیں۔ فرائڈ یہ بھی کہتا ہے کہ ارادہ و مشیّت کی آزادی دراصل ایک خود پسندانہ فریبِ نفس ہے۔ انسانی شخصیّت کا تعین خارجی ماحول سے ہوتا ہے۔ جیسا ماحول مل گیا ویسا ہی انسان بن گیا۔

فلسفۂ اخلاق بھی سراسر مادّی بنیادوں پر استوار کر دیا گیا ہے۔ پروفیسر ڈیوی

---

[۲] اقبال نے ۱۹۳۵ء میں اپنے استاد کے سوانح حیات پڑھ کر اس کی یاد میں ایک مختصر سا مضمون لکھا تھا اور اس کے آغاز میں اسے PHILOSOPHER SAINT "فلسفی ولی" کے لقب سے نوازا تھا۔

لکھتا ہے کہ "اخلاقی اقدار بھی اسی طرح غیر مستقل اور بے ثبات ہیں جس طرح بادل۔ مستقل (ازلی) اقدار کا تصور محض خوش فہمی ہے۔" رہے مسائلِ مابعد الطبیعات تو ان کے متعلق منطقی اثباتیت (LOGICAL POSITIVISM) کا فتوٰے یہ ہے کہ جو شے حواسِ خمسہ سے محسوس نہ ہو وہ ناقابلِ التفات ہے۔ کائنات اور حیاتِ انسانی کے بارے میں سائنس اور فلسفۂ مادّیت کا قولِ فیصل یہ ہے کہ یہ دونوں بے مقصد ہیں۔ انسان کی تقدیر یہ ہے کہ وہ پیدا ہو، کھائے پیئے، افزائشِ نسل کرے اور آخر کار مر کر ہمیشہ کے لیے فنا (معدوم) ہو جائے۔ الغرض جدید سائنس اور فلسفے کی روح، مذہب کے خلاف ہے۔

یہ ہے مختصر طور پر آپ کے مضمون کے ابتدائی حصّے کی توضیح۔ میں نے نہایت اختصار کو مدِّنظر رکھا ہے ورنہ یہ موضوع اس قدر وسیع الذّیل ہے کہ اس پر ایک ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

پھر آپ نے لکھا ہے کہ "اس قسم کی کوشش کا مظہرِ اتمّ برصغیر میں دارالعلوم دیوبند تھا جو کہنے کو تو صرف ایک درس گاہ تھا لیکن واقعتہً اس کی حیثیت ایک عظیم تحریک سے کسی طرح کم نہ تھی۔" نیز یہ کہ "یہ امر واقعی ہے کہ اُن (سرسیّد) کی ان کوششوں سے دین و مذہب کی جان نکل گئی اور مادّہ پرستانہ ذہنیت کے تحت مذہب کا ایک لامذہبی ایڈیشن تیار ہوا۔" میں آپ کے اخذ کردہ ان نتائج سے بالکل متفق ہوں۔ سرسیّد نے مذہب کے درخت میں مغربی فلسفے کا جو پیوند لگایا ہے اس کے اثمارِ تلخ سے پاکستانی مسلمانوں کے کام و دہن بقدرِ ذوق خوب لذت اندوز ہو رہے ہیں۔ دُنیا نوسی ٹائپ کے مسلمان ابھی سے اس تلخی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر رہے ہیں۔ انہیں کون بتائے کہ ؎

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھنا ہوتا ہے کیا

پھر آپ نے لکھا ہے کہ "اِن تحریکوں کا مطالعۂ اسلام اسی مغربی مادّہ پرستانہ نقطۂ نظر پر مبنی ہے جس میں روح پر مادّے کو اور حیاتِ اخروی پر حیاتِ دنیوی کو فوقیّت حاصل ہے۔ اللہ تعالٰی کا اقرار تو موجود ہے لیکن ایمان باللہ کی وہ کیفیّت کہ انفس اور آفاق

میں تنہا وہی فاعل مطلق، مؤثر حقیقی اور مسبّب الاسباب نظر آنے لگے، بالکل مفقود ہے۔۔
رسالت کا اقرار تو موجود ہے لیکن محبت رسولؐ نام کو موجود نہیں ہے۔"

میں آپ سے بالکل متفق ہوں اور آپ کو اس حقائق رسی، ژرف نگاہی اور معرفت نگاری پر داد دیتا ہوں۔ سچّی بات یہی ہے کہ جب تک ایک مسلمان اللہ تعم کو فاعل حقیقی اور مؤثر حقیقی نہ سمجھے وہ قرآنی توحید کے مقام پہ فائز نہیں ہو سکتا۔ اسلامی تصوف جسے جاہل صوفیوں نے بدنام کر دیا، دراصل توحید ہی کو دل و دماغ میں جاگزیں کرنے اور اسے زندگی میں ایک عاملِ مؤثر بنانے اور اس کے تقاضوں پہ عمل کے لیے آمادہ کرنے کا دوسرا نام ہے۔ چنانچہ سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ[1] اپنی تصنیف فتوح الغیب کے تیسرے مقالے میں فرماتے ہیں کہ "اے بیٹے اس بات کو حرزِ جاں بنالے کہ لا فاعل فی الحقیقت ولا مؤثر فی الحقیقت الا اللہ" واحسرتا! آج شیخ موصوفؒ کے نام پر گیارہویں کی نیاز کرنے والے تو لاکھوں ہیں مگر ان کی تعلیم پہ عمل کرنے والا ایک بھی نظر نہیں آتا۔ کس قدر عبرت کا مقام ہے کہ جس بزرگ نے پچاس برس تک مسلمانوں کو یہ تلقین کی ہو کہ اللہ کے سوا کوئی دستگیر نہیں، کوئی مشکل کشا نہیں، کوئی حاجت روا نہیں، آج اس کے نام لیوا خود اسی کو دستگیر اور مشکل کشا سمجھتے ہیں اور اللہ کے بجائے اسی کو پکارتے ہیں۔

پھر آپ نے لکھا ہے کہ "ضرورت اس امر کی ہے کہ اُمّت میں تجدیدِ ایمان کی ایک عظیم تحریک برپا ہو تاکہ ایمان نرے اقرار اور محض قال سے بڑھ کر 'حال' کی صورت اختیار کرے"
میں اس باب میں آپ سے کلّی متفق ہوں۔ اقبال نے اسی بات کو یوں ظاہر کیا ہے

---

[1] شیخ موصوف ۴۷۰ھ میں پیدا ہوئے۔ بیس سال کی عمر میں دینی علوم سے فارغ ہوئے۔ اس کے بعد بیس سال تک اپنے مرشد کے زیرِ تربیت رہ کر تزکیۂ نفس کرتے رہے، چالیس سال کی عمر میں مرشد کے حکم سے تلقین و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور پچاس سال تک مسلمانوں کو توحید کا درس دیتے رہے اور طالبانِ حق کی رہنمائی کرتے رہے۔ ۵۶۱ھ میں بغداد میں وفات پائی۔ ع
رحمتِ ایزدی بر روحش باد!

بالفاظِ دگر انہوں نے بھی یہی علاج تجویز کیا ہے :۔

خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

صحابۂ کرامؓ کی زندگیوں میں ہمیں یہی انقلاب نظر آتا ہے کہ عقیدۂ توحید ان کا حال بن گیا تھا اسی انقلاب کا یہ نتیجہ تھا کہ "انہیں یہ کائنات غیر حقیقی اور محض وہمی اور خیالی نظر آتی تھی لیکن ذاتِ خداوندی ایک زندۂ جاوید حقیقت معلوم ہوتی تھی" وہ جس طرف کو منہ کرتے تھے انہیں اللہ ہی نظر آتا تھا اور وہ ہر واقعے میں اللہ ہی کو کارفرما دیکھتے تھے۔ اکبر الہ آبادی نے ذیل کے شعر میں یہی اندازِ نگاہ پیدا کرنے کی تلقین کی ہے ۔

ارشاد ہے کہ شرک نہ کر اور نماز پڑھ
مطلب یہ ہے کسی کو نہ دیکھ اور ہمیں کو دیکھ

پھر آپ نے لکھا ہے کہ "ایمان بالغیب کے لیے نقطۂ نظر اور طرزِ فکر کی یہ تبدیلی لازمی ہے کہ کائنات غیر حقیقی اور محض وہمی و خیالی نظر آئے۔ لیکن ذاتِ خداوندی ایک زندۂ جاوید حقیقت معلوم ہو ... حیاتِ دنیوی فانی ہی نہیں بالکل غیر حقیقی اور بے وقعت معلوم ہو اور حیاتِ اخروی حقیقی اور واقعی نظر آنے لگے جب تک امت کے ایک قابلِ ذکر حصّے میں نقطۂ نظر کی یہ تبدیلی رونما نہ ہو، احیائے اسلام کی آرزو ہرگز ہرگز شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکے گی"۔ میں آپ کی اس بات سے بکلّی اتفاق کرتا ہوں بلکہ میری دلی آرزو یہ ہے کہ اللہ آپ کو توفیق دے کہ آپ اس صداقتِ عظمیٰ کو پاکستان ہی نہیں تمام دنیائے اسلام میں شائع کر سکیں اور ہر مسلمان تک پہنچا سکیں۔ میں پچاس برس کے غور و فکر کے بعد جس نتیجے پر پہنچا، اللہ نے آپ کو دس پندرہ سال کے غور و فکر کے بعد اسی نتیجے پر پہنچا دیا اور مزید کرم یہ کیا کہ اسے پیش کرنے کی سعادت بھی آپ کو عطا فرمائی ۔

بیسویں صدی میں مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کے لیے جو تحریکیں ہندوستان اور دوسرے اسلامی ملکوں میں برپا ہوئیں وہ سب میری نگاہوں کے سامنے ہیں اور میں نے اپنی آنکھوں سے ان تحریکوں کو ناکام ہوتے دیکھا ہے ۔ سبب اس ناکامی کا وہی ہے جو آپ نے بیان کیا

ہے کہ جن لوگوں نے یہ تحریکیں برپا کیں ان میں بنیادی نقص یہ تھا کہ اللہ کے ساتھ ان کا تعلق محض قال تک محدود تھا بالفاظِ دگر وہ اسلام کا نام تو لیتے تھے، مگر اس کی روح سے بیگانہ تھے۔ اسلام کی روح، جیسا کہ میں سمجھا ہوں محض ارکانِ اسلام کی رسمی پابندی نہیں ہے بلکہ دل کی آنکھوں سے اللہ عزوجل کا مشاہدہ یا اُس ذاتِ پاک کے ساتھ ایسا شدید قلبی رابطہ ہے جو مسلمان کو اس مقام پر پہنچا دے جہاں پہنچ کر ہر وقت اللہ ہی پیشِ نظر رہتا ہے۔ غیر اللہ کی ہستی کالعدم ہو جاتی ہے۔

پھر آپ نے لکھا ہے "عوام کے قلوب میں ایمان کی تخم ریزی اور آبیاری کا مؤثر ترین ذریعہ ایسے اصحابِ علم و عمل کی صحبت ہے جن کے قلوب اور اذہان معرفتِ ربّانی سے منوّر ہوں اور سینے، کبر و حسد، بغض و عناد سے پاک ہوں اور زندگیاں حرص و طمع اور حبِّ دنیا سے خالی ہوں"۔

مَیں اس معاملے میں بھی آپ سے بکلّی متفق ہوں، ازراہِ تفاخر نہیں بلکہ بطور اظہارِ حقیقت یہ بات لکھ رہا ہوں کہ میں نے پچاس سال سے زائد عرصہ منطق، فلسفہ، الٰہیات اور علم کلام کے مطالعے میں ضائع کیا لیکن خدا گواہ ہے کہ نہ تو ان علوم و فنون سے اللہ کے ساتھ تعلق پیدا ہوا اور نہ کتابوں سے کبر و حسد، بغض و ریا اور حرص و طمع کا ازالہ ہوا۔ ان امراضِ خبیثہ کا ازالہ تو کیا ہوتا الٹا میرا دماغ شکوک و شبہات کی جولانگاہ بن گیا اور اگر اس عالم پیری میں (سن ولادت ۱۳۱۳ھ) توفیقِ ایزدی تصوّف کے نخلستان میں نہ پہنچا دیتی تو آج تشکیک کے ریگستان میں العطش العطش پکارتا ہوتا۔ شکر ہے کہ وفات سے پہلے یہ حقیقت مجھ پر منکشف ہو گئی کہ

نہ کتابوں سے نہ کالج سے نہ زر سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا (اکبرؔ)

سچ کہا ہے شیخ سعدیؒ نے:۔

جز یادِ دوست ہر چہ کنی عمر ضائع ست — جز حرفِ عشق ہر چہ بخوانی بطالت است
سعدی بشوئے نقشِ دوئی را ز لوحِ دل — علمے کہ راہِ حق نہ نماید، جہالت است

نیز سچ کہا ہے مرشد رومیؒ نے:۔

علم چہ بود ؟ آنکہ رہ بنمایدت زنگِ گمراہی ز دل بزدایدت
علم بنود غیرِ علمِ عاشقی مابقی، تلبیسِ ابلیسِ شقی

یہ صحبت ہی کا تو ثمرہ تھا کہ ابوؓ ابی قحافہؓ، صدّیق اکبرؓ کے مقام پہ فائز ہوگئے اور یہ صحبت ہی کا تو کرشمہ تھا کہ ابنِ خطّاب کو فاروق اعظمؓ کا مرتبہ حاصل ہوگیا ۔ رضی اللّٰہ عنہما

اسی لیے اقبالؔ نے یہ کہا :-

صحبت از علمِ کتابی خوشتر است
صحبتِ مردانِ حر ، آدم گر است
دیں مجو اندر کتب اے بے خبر
علم و حکمت از کتب، دیں از نظر

پھر آپ نے لکھا ہے کہ " وقت کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ ایک زبردست علمی تحریک اٹھے جو تعلیم یافتہ طبقات اور ذہین افراد میں انقلاب برپا کر دے یعنی انہیں خدا پرستی اور خود شناسی کی دولت سے مالا مال کر دے ... . الخ "

مَیں آپ کی ان تجاویز سے بکلّی متفق ہوں اور اس دُعا پر اس خط کو ختم کرتا ہوں کہ اللّٰہ آپ کو عصرِ حاضر میں دعوت و تبلیغِ اسلام کی توفیق ارزانی فرمائے اور یہ حقیقت آپ پر واضح کر دے کہ مقصدِ حیات استرضاءِ باری تعالیٰ ہے نہ کہ حصولِ حکومتِ ارضی ۔ حکومت یا خلافتؒ ایمان و عمل صالح کا ثمرہ ہے نہ کہ مقصود بالذات شئے ۔ اور آپ سے استدعا ہے کہ آپ اس ننگِ خلائق کے خاتمہ بالخیر کی دُعا فرمائیں ۔

وقتِ طلوع دیکھا ، وقتِ غروب دیکھا
اب فکرِ آخرت ہے ، دنیا کو خوب دیکھا (اکبرؒ)

والسّلام خیرالختام
مجمع عیوب وزشتی یوسف سلیم چشتی

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ

جماعت صحابہ کرام کی ایک جلیل المرتبت شخصیت
تفسیر قرآن میں ان کا مقام سب سے بلند تھا

مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

وہ حضرات جنہیں اللہ رب العزت نے اپنے آخری رسول محمد عربی صلوات اللہ تعالیٰ علیہ وسلامہ کی صحبت و رفاقت کے لئے چنا تھا، ان کا مقام جتنا اہم ہے اس کا شعور و احساس ہر اس غیرت مند انسان کو ہے جسے اہلسنت وجماعت میں ہونے کا شرف حاصل ہے اور جو اس کی حقیقت سے واقف ہے۔ قرآن عزیز نے ان حضرات کو معیار حق وصداقت (البقرہ: ۳۰، ۱۳۷) قرار دیا اور حضور علیہ السلام نے انہیں آسمان ہدایت کے ستاروں سے تعبیر فرمایا اس عظیم المرتبت جماعت میں ایک بزرگ کا نام حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہے جو حضور علیہ السلام کے خصوصی خادم ہونے کی حیثیت سے "صاحب النعلین والسواك والوساد والسواد" (جوتے، مسواک اور تکیہ وغیرہ لائے جانے کی خدمت کرنے والے) کی حیثیت سے مشہور تھے۔ آپ کی پیدائش کے متعلق ارباب تذکرہ نے لکھا ہے کہ ۱۲ھ عام الفیل میں پیدا ہوئے اور جس طرح معاشرہ کے دوسرے درجہ کے لوگوں نے ابتدا میں قبول اسلام کی سعادت حاصل کر کے نسبی پجاریوں کو پیچھے چھوڑ دیا، اسی طرح کا معاملہ آپ کا بھی ہے کیونکہ آپ مشہور قریشی سردار عقبہ بن ابی معیط کی بکریاں چرانے کی ڈیوٹی پر مامور تھے اور "ھذلی غلام" کے نام سے مشہور" ارباب تاریخ نے آپ کو چھٹا مسلمان لکھا ہے اور صاحب اسد الغابہ نے ایک روایت آپ سے خود نقل کی جسکا سلسلہ روایت اس طرح ہے۔

اعمش عن القاسم بن عبد الرحمٰن عن ابیہ

اس روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے فرمایا :

لقد رأیتنی سادس ستة ما علی ظهر الارض مسلم غیرنا

(اسدالغابۃ ج ۳ ص ۲۵۶ مطبوعہ ریاض)

یعنی روئے زمین پر اپنے سمیت چھ حضرات کے علاوہ میں نے کسی کو مسلمان نہیں دیکھا -

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چھٹے مسلمان تھے - آپ کی والدہ محترمہ "ام عبد" اور بھائی "عقبہ" بھی قدیم الاسلام صحابی تھے جیسا کہ امام نووی رحمہ اللہ تعالےٰ نے تصریح کی ہے اور عقبۃ کو "صحابی ابن صحابیۃ" لکھا ہے (نووی ص ۳۷)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالےٰ عنہ کا قبول اسلام حضور نبی اکرم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کا معجزہ قرار دیا جاتا ہے جسکی تفصیل دوسری کتب کے علاوہ اسدالغابہ ج ۳ ص ۵۷ - ۲۵۶ میں موجود ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

حضور علیہ السلام حضرت ابوبکر صدیق کی معیت میں کہیں جا رہے تھے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ بکریاں چرا رہے تھے یہ بکریاں عقبہ بن ابی معیط کی تھیں - آپ نے اُن سے فرمایا کہ بیٹے تمہارے پاس دودھ ہے، انہوں نے عرض کیا دودھ تو ہے لیکن میں پیش اسلئے نہیں کر سکتا کہ وہ میرے پاس امانت ہے (اور یہ ان کے عظمتِ کردار کی دلیل تھی) - حضور علیہ السلام نے اُن سے ایسی بکری کا تقاضا کیا جو ہنوز دودھ کی عمر کو نہ پہنچی ہو اور جفت نہ ہوئی ہو انہوں نے ایسی ایک بکری پیش کی تو رسول کریم علیہ السلام اس کے تھنوں پر ہاتھ پھیرنے لگے اللہ کی قدرت سے دودھ اتر آیا، آپ نے اپنے ہاتھ سے دودھ دوہا، اور حضرت ابوبکر کو پلا کر پھر خود پیا - اس کے بعد تھنوں کو مخاطب کر کے کہا کہ سابقہ حالت پر آجاؤ چنانچہ ان کی اصل کیفیت ظاہر ہو گئی اور دودھ غائب ہو گیا - اس واقعہ کے بعد وہ حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یہ کلام (یا یہ قرآن) مجھے سکھائیں، آپ نے محبت کے ساتھ ان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ارشاد فرمایا کہ تم تو ایسے بچے ہو جسمیں شان معلمی پنہاں ہے -

چنانچہ انہوں نے براہ راست رسولِ اکرم علیہ السلام سے ستر سورتیں سیکھنے کی

سعادت حاصل کی بعض تذکرہ نگاروں نے جو یہ لکھا ہے کہ دودھ کا یہ قصہ حضور اکرم علیہ السلام کے سفر ہجرت کا ہے (دائرۃ المعارف پنجاب یونیورسٹی ص ۶۸۸) تو یہ صحیح نہیں کیونکہ آپ تو چھٹے صحابی ہیں، اس لئے یہ طے ہے کہ یہ قصہ بالکل ابتدائے اسلام کا ہے قرآن عزیز سے آپ کے قلبی لگاؤ اور تعلق کا ایک واقعہ وہ بھی ہے جسے حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے ان کے صاحبزادے حضرت عروہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے نقل کیا — کہ ایک دن اصحاب رسول کے مجمع میں یہ گفتگو ہوئی کہ قریش کے اجتماعی مجامع میں آج تک جہر سے قرآن نہیں پڑھا گیا اور نہ ہی انہوں نے اس طرح سنا ہے، اس کی کوئی سبیل ہونی چاہیئے — سوال یہ ہے کہ اس جبر کے ماحول میں اس کا اہتمام کون کرے؟ حضرت عبداللہ بن مسعود نے کمال جرأت سے اس کام کو اپنے ذمہ لیا، صحابۂ رسول نے کہا بھی کہ قریش بڑے ظالم ہیں بپھرے ہوتے ہیں، اسلام اور رسول رحمت سے انہیں سخت عناد ہے، قرآن اس طرح سننا انہیں قطعاً گوارا نہ ہوگا اور پھر آپ کا معاملہ ایسا ہے کہ آپ کا کوئی قبیلہ برادری یہاں نہیں جس کا خوف قریش کو ہو، کوئی ایسا شخص ہو جس کا قبیلہ برادری ہو اور اس کا قریش پر اثر ہو اور وہ اسکی جرأت کرتے تو صحیح رہے گا ورنہ قریش تو آپ پر زیادتی کریں گے لیکن مردانِ حُر کے انداز نرالے ہوتے ہیں انہوں نے کمال جرأت سے کہا کہ کچھ ہو یہ خدمت و سعادت میں حاصل کروں گا رہ گیا میری حفاظت کا معاملہ، تو اس سلسلہ میں مجھے اللہ رب العزت پر بھرپور اعتماد ہے وہی میری مدد و نصرت کرے گا۔ چنانچہ دوپہر سے قبل جبکہ رؤسا قریش اپنی بیٹھک اور دارالندوہ میں جمع تھے، آپ وہاں جا دھمکے اور پوری آواز کے ساتھ سورۂ رحمٰن کی تلاوت شروع کر دی — ایک مرتبہ تو قریش اتنے متاثر ہوئے کہ وہ انہی الفاظ کو دھرانے لگے لیکن پھر شیطان و نفس کے غلبہ سے بولے، ارے یہ تو وہ کلام پڑھ رہا ہے جو محمد کریم علیہ السلام لے کر آئے ہیں — چنانچہ وہ اٹھ کھڑے ہوئے، اور آپ کو مارنا شروع کر دیا، ان بدبختوں نے آپکے چہرہ پر مارا جس سے وہ سوج گیا — خیر وہ وہاں سے اپنے احباب کے پاس واپس آئے انہیں ماجرا سنایا، انہوں نے کہا کہ ہمیں اسی کا ڈر تھا — ابن مسعود کا جرأت مندانہ جملہ یہ تھا، ان دشمنانِ خدا کے مقابلہ میں اب مجھے آسانی ہو گئی، اگر تم چاہو تو بارِ دیگر ایسا ہی کرنے کو

رہوں صحابہ نے فرمایا کہ بس میاں، تم نے کمال کر دیا جس بات کو وہ ناپسند کرتے
تم نے سنا دی (اب آگے ان کا مقدر) قبولِ اسلام کے بعد رسول اکرم علیہ السلام
انہیں خدمت کا موقع اس طرح بخشا کہ آپ کے لئے وضو، غسل کا اہتمام، سونے کے
جگانا، آپکے جوتے مبارک سنبھالنا اور اس نوع کی خدمات ان کے مقدر میں آئیں،
ں کے سبب انہیں حضور علیہ السلام کا ایسا ساتھی کہا جانے لگا جو صاحب النعلین
سواک وغیرہ ہو اور یہ ان کا منفرد اعزاز تھا۔ حضور علیہ السلام کی ہجرتِ مدینہ سے
ں حبشہ کی جو ہجرت ہوئی اس میں آپ کو شرکت کا موقعہ ملا۔ ہجرتِ مدینہ کا موقعہ
سر آیا، دونوں قبلوں کی طرف نماز پڑھنے کی توفیق میسر آئی اور بدر سمیت جملہ اہم مقامات
آپ شامل سفر تھے حتیٰ کہ بدر میں سب سے بڑے دشمن اسلام ابوجہل کی گردن کاٹنے
فخر انہیں حاصل ہوا — گو عشرہ مبشرہ میں ان کا نام نہیں لیکن حضور علیہ السلام نے
ں واضح طور پر جنت کی بشارت دی۔ اور حضور علیہ السلام نے وادی محسر میں
ت کو جو تبلیغ کی جس کے نتیجہ پر جنات مسلمان ہوئے جس کا ذکر سورۃ الجن اور
رۃ الاحقاف میں ہے، اس موقعہ پر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ ساتھ
ے — سانحہ ارتحال نبوی کے بعد "یرموک" کے اہم ترین میدان میں آپ کو شرکت
موقعہ میسر آیا۔ آپ کی علمی جلالت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ مفسر قرآن حضرت
اللہ بن عباس (ترجمان القرآن اور حبر امت) شیخ الصحابہ حضرت عبداللہ بن عمر،
ضرت ابوموسیٰ اشعری، حضرت عمران بن حصین، حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت جابر
ن عبداللہ، حضرت انس بن مالک (خادم خاص رسول اکرم فی المدینہ) حضرت ابوسعید
دری، محدث اعظم حضرت ابوہریرۃ اور حضرت ابورافع رضی اللہ تعالیٰ عنہم جیسے صحابہ
سے روایت و استفادہ کرتے نظر آتے ہیں جبکہ تابعین کی ایک بڑی جماعت آپ
ی شاگرد ہے اور فقہ حنفی جسے دنیا کے ¾ مسلمانوں میں قبولیت حاصل ہے — اس
ماخذ آپکی ذات مبارکہ، آپ کی روایات و فتاوی اور اجتہادات ہیں،

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم سے آپ کے تعلق خاطر کا اندازہ اس
ے ہوسکتا ہے کہ جلیل المرتبت صحابی حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے
ں کہ میں اور میرا بھائی یمن سے مدینہ منورہ آئے تو حضرت عبداللہ بن مسعود اور انکی

والدہ محترمہ کا کاشانۂ نبوت میں جس کثرت و عمومیت سے آنا جانا تھا اس سے ہم نے اندازہ لگایا کہ یہ حضرات اہل بیت نبوی میں سے ہیں (اہل بیت کا اطلاق بنیادی طور پہ ازواجِ مطہرات پر ہوتا ہے جیسا کہ سورۃ احزاب کی آیات ۲۸ تا ۳۴ سے ثابت ہے تبعاً باقی اعزہ بھی اس میں شامل ہیں) حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جب سوال ہوا کہ سیرت و کردار کے اعتبار سے نبی کریم علیہ السلام کے قریب ترین شخصیت سے ہمیں آگاہ کیا جاتے تو ان کا جواب حضرت ابن مسعود کے متعلق تھا اور اصحاب محمد علیہ السلام انہیں "اقربھم الی اللہ زلفی" میں شمار کرتے (وہ لوگ جو اللہ رب العزت کے خاص مقرب ہوں اور جن کا تعلق مع اللہ خوب سے خوب تر ہو۔) سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ روایت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی منقبت میں بڑی اہمیت کی حامل ہے جس میں انہوں نے فرمایا۔

لَوْ كُنْتُ مُؤَمِّرًا اَحَدًا مِنْ غَيْرِ مَشْوَرَةٍ لَاَمَّرْتُ ابْنَ اُمِّ عَبْدٍ

اگر بغیر مشورہ میں اپنے طور پر کسی کو اپنا جانشین اور تمہارا امیر مقرر کرتا تو وہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہوتے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر کام چونکہ امت کے حق میں ایک اہمیت کا حامل ہے، اس لئے نظمِ مملکت کا معاملہ امت کے ارباب فہم و علم اور اہل صلاح و تقویٰ کے باہمی مشورہ پر چھوڑ دیا گیا تاکہ آئندہ کوئی غلط رسم نہ چل نکلے ورنہ بقول حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود اپنے علم و تقویٰ، فہم و فراست اور نظم و انتظام کی صلاحیتوں میں اس حیثیت کے انسان تھے کہ اس منصب کی نزاکتوں کو بخوبی پورا کر سکتے تھے ـــــ یہی وجہ ہے کہ جناب رسالت مآب کے جانشین اور امرا انکی بڑی قدر کرتے حتیٰ کہ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو امیر اور انہیں وزیر و معلم بنا کر کوفہ بھیجا اور اہل کوفہ کو لکھا کہ

> یہ دونوں حضرات اصحاب محمد علیہ السلام میں سے منتخب ترین شخصیتیں ہیں، انکی اقتداء کرو، ان کی اطاعت کرو اور انکی بات توجہ اور گوش ہوش سے سنو، یاد رکھو کہ میں نے (بطور خاص)، عبداللہ بن مسعود کو اپنے

بجائے تمہارے لئے منتخب کیا اور یہ فیصلہ ترجیحی ہے (تاکہ تم اپنے دین وعلم کے معاملہ میں ان سے فیضیاب ہو سکو)

حضرت علی رضی اللہ تعالٰے عنہ کے پاس بعض لوگ بیٹھے تھے انہوں نے کہا کہ اخلاق کے اعتبار سے احسن، تعلیم وتعلم کے اعتبار سے ارفق (نہایت مشفق ومہربان) صحبت مجلس کے اعتبار سے نہایت بہتر اور ورع وتقویٰ میں عبداللہ بن مسعود سے بڑھکر ہم نے کسی کو نہیں دیکھا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ یہ بات تم صدق دل سے کہہ رہے ہو (یا محض بناوٹ وتصنع ہے) انہوں نے کہا کہ دل سے ہم یہ کہہ رہے ہیں تو جناب علی نے فرمایا پھر میں وہی کہتا ہوں جو وہ کہتے ہیں یعنی وہ واقعی ایسے ہی ہیں

اصحاب رسول علیہ السلام انہیں قرآن کا سب سے بڑا عالم جانتے اور اس کا سبب حضور علیہ السلام کے ارشادات تھے۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالٰے عنہ کی ایک روایت تذکرۃ الحفاظ میں امام ذہبی رحمۃ اللہ تعالٰے نے نقل کی کہ ایک دفعہ پر حضرت نبی کریم علیہ السلام نے مختصر خطبہ دیا پھر حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور بعض دوسرے حضرات سے خطبہ دلایا اس کے بعد حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالٰے عنہ کو خطبہ کا ارشاد ہوا، انہوں نے خطبہ دیا تو نبی رحمت نے فرمایا۔

ابن ام عبد نے درست کہا، سچ کہا (ص ۳۷ ج مطبوعہ لاہور)

آپ کی احتیاط پسندی کے متعدد واقعات نقل کئے گئے ہیں کہ حدیث رسول بیان کرتے وقت لرزہ براندام ہو جاتے اور بڑی احتیاط سے الفاظ ارشاد فرماتے مبادا منہ سے کوئی ایسا لفظ نکل جائے جو سرکار دوعالمؐ کی زبان سے نہ نکلا ہو اور اس پر گرفت ہو جائے۔ اس لئے فرماتے۔

آپؐ نے اس طرح فرمایا یا اس کی مثل فرمایا یا اس کے قریب قریب فرمایا۔

آپ کی وفات کے متعلق لکھا ہے کہ مرض الموت میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالٰے عنہ ان کی عیادت کو آئے تو انہیں روتا پایا اس کا سبب پوچھا تو انہوں نے کہا میں اپنے گناہوں کے سبب روتا ہوں۔ انہوں نے پوچھا کس چیز کی خواہش ہے اس کے جواب میں آپ نے کہا کہ بس اپنے رب کی رحمت کی خواہش ہے اور بس ــــ حضرت عثمانؓ نے کہا کہ میں آپ کے لئے طبیب کا اہتمام کروں تو انہوں نے کہا کہ طبیب حقیقی

کی حکمت نے تو بیمار کیا اب اس سے مقابلہ تو نہیں کرنا (جسمیں وہ راضی اس میں ہم راضی) انہوں نے مالی تعاون کا کہا تو فرمایا اسکی ضرورت نہیں، انہوں نے کہا کہ آپ کی بیٹیوں کے لئے کوئی انتظام ہو جائے تو فرمایا کہ میری بیٹیوں کے معاملہ میں آپ کو فقر و فاقہ سے نہ ڈرنا چاہیئے کیونکہ میں نے ان سے کہدیا ہے کہ ہر رات سورۂ واقعہ پڑھیں تو فقر قریب نہ آئیگا۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ :

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ والہٖ واصحابہ وسلم سے سنا آپ فرماتے کہ جو شخص ہر رات سورۂ واقعہ پڑھے گا فقر و فاقہ اس کے قریب نہ آئے گا۔"

آپ ہی وہ صحابی ہیں جنہیں رسول اللہ نے فرمایا تھا کہ مجھے قرآن پڑھکر سناؤ۔ انہوں نے عرض کیا کہ آپ پر تو قرآن اترتا ہے تو حضور علیہ السلام نے فرمایا "مجھے دوسروں سے سننے کی خواہش ہے اور میں اسے پسند کرتا ہوں" چنانچہ آپ نے سورۂ نساء شروع کی جب آیت ۴۱ پر پہنچے تو حضور علیہ السلام کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ آیت ہے۔

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا ۔

"بھلا اس وقت ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے ایک ایک احوال بتانے والے طلب کریں گے اور اے محمد آپ کو ان لوگوں پر یعنی آپ کی امت پر بطور گواہ لائیں گے۔"

(ترجمہ مولانا احمد سعید دہلوی)

اس شہادت سے مراد یہ ہے کہ جس طرح تمام امتوں سے دریافت کیا جائیگا کہ تم نے اپنے اپنے نبیوں کی دعوت کا کیا جواب دیا، اس طرح پیغمبروں کو بھی بلا کر ان سے دریافت کیا جائیگا کہ تمہاری امتوں کا تمہارے ساتھ کیا سلوک تھا؟ تاکہ مجرموں پر فرد جرم عائد ہو سکے۔ حدیث میں ہے کہ حضور علیہ السلام کے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے اور آپ نے فرمایا "عبداللہ بس، عبداللہ بس"۔ اور عرض کیا اے میرے اللہ میں ان پر تو شہادت دے سکتا ہوں جن میں موجود ہوں اور جن میں موجود نہ ہوں گا ان

کے متعلق کیسے گواہی دونگا (ابن ابی حاتم) ، تاہم حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ تعالیٰ کا ایک قول تفسیر قرطبی میں ہے اور بعض دوسرے حوالہ جات سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح امت اجابت کو حضور علیہ السلام آثارِ وضو سے پہچان لیں گے ۔ اسی طرح امتِ دعوت کے لئے بھی ایک نشانی ہوگی جس سے انہیں پہچان لیا جائے گا ۔ (اس نشانی کی تفصیل نہیں مل سکی) محدثین نے آپ سے مروی روایات کی تعداد ۸۴۸ بتائی ہے جن میں زیادہ تر روایات قرآن اور قرآنی علوم سے متعلق ہیں ۔

امام المحدثین حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ تعالیٰ (جو فقہاء اربعہ میں سے ایک ہیں) کی حدیث میں مشہور و معرکۃ الآراء کتاب "مسند" کی جلد اول کے ص ۳۷۴ سے ص ۴۶۶ تک "مسند عبداللہ بن مسعود" شامل ہے جس میں حضرت الامام نے مرویات ابن مسعود جمع کردی ہیں بیروت کا مطبوعہ نسخہ جو ہمارے پیش نظر ہے نہایت ہی باریک ٹائپ کے ۹۲ صفحات اس عظیم تر صحابی کی ان روایات پر مشتمل ہیں جو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیں اور یا ان کے اجتہادات ہیں ۔ اور ظاہر ہے کہ "صحابی" کا اجتہاد معمولی درجہ کا نہیں ہوتا ، اول تو ایک حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زبان سے "اجتهد برأي" کے الفاظ سن کر حضور علیہ السلام نے نہایت خوشی و مسرت کا اظہار کیا دوسرے صحابہ کے متعلق "کلهم عدول" کا اجتماعی عقیدہ ان کی عظمت شان کے مطابق ہے اور پھر حضرت عبداللہ بن مسعود جیسے صحابی جنہیں جناب رسالت مآب سے بے پناہ تعلق رہا اور ابتداء سے ہی جوذات نبوی سے چمٹ گئے ، ان کے تفقہ اور اجتہاد کا کیا مقام ہوگا ؟ رہ گیا معاملہ ان کی تفسیری روایات کا تو وہ ہر دوسرے صحابی کے مقابلہ میں زیادہ ہیں اور ان سے خاص طور پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن سیکھنے کی لوگوں کو توجہ دلائی ــــ علماء کے ایک بڑے طبقہ کی رائے یہ ہے کہ جماعت صحابہ میں "بطور مفسر" ان کا سب سے بڑا مقام ہے ہندوستان کے مشہور عالم مولانا امتیاز علی خان عرشی مرحوم (رام پور) نے تفسیر ابن مسعود کو ایڈٹ کرکے اپنے یہاں سے بڑے اہتمام سے شائع کیا جو طلبائے قرآن کے لئے ایک یادگار چیز ہے ــــ بعض روایات کا خلاصہ مسند احمد سے نقل کرنے کو جی چاہتا ہے تاکہ آپ کی تفسیری آراء اور اجتہادات کا عام لوگوں کو علم ہوجائے ۔

قرآن عزیز کا واضح فیصلہ ہے کہ مشرک کی بخشش نہ ہوگی — اس حوالہ سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ

"دو باتیں بڑی واضح ہیں، ان میں سے ایک تو وہ ہے جو میں نے اپنے آقا علیہ السلام سے سنی دوسری میرا اجتہاد ہے — جو بات میں نے رسول محترم علیہ السلام سے سنی وہ یہ ہے کہ جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا اور اسی حال میں مر گیا اسکی بخشش نہ ہوگی اور اس کے ساتھ دوسری بات جو میرا اجتہاد ہے وہ یہ ہے کہ جو اس حال میں دنیا سے رخصت ہوا کہ اس نے اللہ تعالےٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرایا اور اس کا کسی کو ساتھی نہیں بنایا وہ جنت میں داخل ہوگا۔

سُورۃ مجادلہ کے دوسرے رکوع کی ابتدا میں سرگوشیوں سے منع فرمایا گیا اس پر حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا جب تم تین ہو تو دو الگ سے سرگوشی نہ کرو کہ اس سے تیسرے کو تکلیف ہوگی۔

قرآن عزیز نے "توبہ" پر بڑا زور دیا ہے اور کہا ہے کہ اچھی طرح توبہ کرو — جسکا انجام اللہ تعالےٰ کی رحمت کی شکل میں سامنے آئیگا — توبہ کیا ہے۔

حضرت ابن مسعود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں۔

الندم التوبہ، الندم التوبہ یعنی ندامت ہی توبہ ہے۔

جب آدمی کئے پر پچھتائے تو گویا اس نے توبہ کر لی۔ اللہ کو اس کا پچھتانا پسند آجاتا ہے۔

سُورۃ آل عمران کی آیت ۷۷ میں اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ اللہ سے کئے گئے عہد اور قسموں کو تھوڑی قیمت پر فروخت کرنے والوں کا انجام یہ ہوگا کہ انہیں آخرت میں بھلائی سے کوئی حصہ نہ ملے گا نہ اللہ تعالےٰ ان سے محبت و مروت کی گفتگو کریں گے نہ نظرِ شفقت سے دیکھیں گے اور نہ انہیں پاکیزگی نصیب ہوگی — اس آیت کے متعلق روایت ہے۔

کہ جو قسم اٹھائے تاکہ اس کے ذریعہ مسلمان کا مال ہڑپ کر سکے تو وہ اللہ تعالےٰ سے اس حال میں ملاقی ہوگا کہ رب العزت اس پر

غضب ناک ہوں گے ۔

گویا نام خداوندی جس کے ساتھ قسم کھائی جاتی ہے، کو دنیوی مفادات کے لئے کسی طرح بھی استعمال کرنے والا غضب خداوندی کا شکار ہوگا ۔ آل عمران کی آیت ۱۸۰ میں زکوٰۃ وغیرہ سے اعراض کرنے والوں کے لئے "طوق" کا ذکر ہے اس کی تفصیل آپ کی روایت میں اس طرح ہے ۔

"کہ وہ گنجا سانپ ہوگا جو انسان کا تعاقب کرے گا، انسان اس سے دوڑے گا ۔ لیکن بے سود، وہ اس کو لپٹ جائیگا اور کہے گا کہ میں تیرا (کنز) "خزانہ" ہوں ۔"

الانعام کی آیت ۸۲ میں ان اہل ایمان کے مامون ہونے کا ذکر ہے جن کا ایمان "ظلم" کی آمیزش سے پاک ہے، اس پر پریشانی ہوئی تھی سو ہوئی کہ ظلم تو عام ہے ۔ کسی نہ کسی درجہ میں اس کا ارتکاب ہو ہی جاتا ہے لیکن حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت نے بتایا کہ اس سے مراد "شرک" ہے اور دلیل میں سورۃ لقمان کا حوالہ دیا جسمیں ہے ۔ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۔

سورۃ الفرقان کی آیت ۶۸ میں "عباد الرحمن" کی صفات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ :

وہ اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کی پرستش نہیں کرتے، بلا وجہ کسی کو قتل نہیں کرتے اور بدکاری سے اجتناب کرتے ہیں ۔

اس آیت کی وضاحت میں حضرت ابن مسعود کی روایت ہے کہ

"رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے سوال ہوا کہ سب سے بڑا گناہ کونسا ہے ؟ آپؐ نے فرمایا اللہ تعالےٰ کے ساتھ تو کسی کو شریک ٹھہراتے حالانکہ اس نے تجھے پیدا کیا ہے پھر سوال ہوا کہ اس کے بعد ؟ تو فرمایا کہ تو اپنے لڑکے کو اس لئے قتل کردے کہ کل وہ تیرے ساتھ کھانا کھائے گا (خاندانی منصوبہ بندی) پھر سوال ہوا تو فرمایا کہ تو زنا کا ارتکاب کرے بقول حضرت عبداللہ اس کی تصدیق میں اللہ تعالےٰ نے یہ آیت اتاری ۔

سورۃ دخان میں دخان کے عذاب سے حضرت عبداللہ بن مسعود مکہ کا مشہور

قحط مراد لیتے ہیں جس میں لوگوں نے ہڈیوں پہ گذارہ کیا اور ہر شخص آسمان کی طرف دیکھتا کہ شاید ابر نظر آئے لیکن اسے دھواں نظر آتا۔ اس کیفیت نے پورے معاشرہ کو لپیٹ میں لے لیا، اس پہ حضور علیہ السلام سے دُعا کی درخواست ہوئی تو یہ بلا ٹلی۔ "و کاشفوا العذاب" اس دُعا کے ثمرہ کی طرف اشارہ ہے لیکن چونکہ قریش کی خرمستی ختم ہونے والی نہ تھی اور یہ بات اللہ تعالیٰ کے علم میں تھی اس لئے ساتھ ہی فرمادیا

وہ دن قریب ہے جب ہم سختی کے ساتھ پکڑیں گے۔ اور سخت بدلہ لیں گے۔

اس سے مراد بدر کا دن ہے، جس دن کفار کی طاقت زیر و زبر ہوئی۔

آپ کی رائے یہ تھی جس کا آپ نے واضح طور پہ اظہار کیا جبکہ بعض حضرات اس کا تعلق قیامت سے جوڑتے ہیں لیکن آپکے دلائل کو امت نے تسلیم کر کے اس سے قحط، دعائے نبوت اور پھر یوم بدر مراد لیا۔

ایک صاحب نے رمضان میں اپنی بیوی کا بوسہ لے لیا پھر نبی کریم علیہ السلام سے سوال کیا تو بقول حضرت ابن مسعود سورۃ ہود کی آیت اتری ۱۱۴)

"آپ دن کے دونوں کناروں اور رات کے کچھ حصوں میں نماز کی پابندی کیجئے بے شک نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں — (معمول گناہوں کے ازالہ کی اللہ تعالیٰ نے گویا یہ ترکیب بتائی)، اسی لئے حضورؐ نے فرمایا" جو میری اُمت میں اس قسم کا کام کر بیٹھے اس کے لئے یہی کفارہ ہے۔

سورہ لقمان کی آخری آیت میں "مغیبات خمسہ" کا ذکر ہے — اس آیت کے ضمن میں حضرت ابن مسعود کی رائے گرامی ہے کہ

تمہارے نبی کو ان پانچ چیزوں کے علاوہ باقی سب چیزوں سے آگاہ کیا گیا (اجمالی طور پہ یا تفصیلی طور پہ)

واقعہ معراج میں سورۃ نجم میں "اِذْ یَغْشَی السِّدْرَۃَ مَا یَغْشٰی" سے مراد بروایت حضرت ابن مسعود "سونے کا فرش" ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں تھا۔ آپ ایک لکڑی پہ ٹیک لگائے ہوئے کھڑے تھے، یہود کا ایک گروہ گذرا، آپس میں مشورہ کر کے انہوں نے رُوح کے متعلق سوال کیا — تو آپ اسی طرح ٹیک لگائے کھڑے ہو گئے، مجھے فوراً وحی کا احساس ہوا چنانچہ بروقت جواب

آیا قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ الخ (فرمایئے کہ رُوح میرے رب کے امر سے ہے،
(بنی اسرائیل)

قرآن عزیز نے سورۂ بقرہ میں اجمالی طور پر انبیاء کی باہمی فضیلت کا ذکر کیا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نام لے کر انبیاء کے باہمی تقابل سے لوگوں کو روکا کہ اسمیں سوءِ ادب ہے خاص طور پر حضرت یونس بن متی کے متعلق فرمایا۔

تم میں سے کسی کے لئے اجازت نہیں کہ وہ یوں کہے کہ میں یونس علیہ السلام سے بہتر ہوں۔

پیغمبرانہ بصیرت پر قربان جایئں — آئندہ چل کر بعض مفکر و دانشور اور قائدین ایسے پیدا ہوئے جنہوں نے یونس علیہ السلام پر "بے صبری" کا الزام لگا کر بے جا جسارت کر کے اپنے آپ کو مجرم بنایا — حالانکہ وہ نبی اللہ تھے اور نبی معصوم ہوتا ہے اور لوگوں کی تنقید و جرح سے بالاتر۔ اور آخر میں سورۂ المائدہ کی آیت ۷۸ جس میں بنی اسرائیل پر حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ کے حوالہ سے لعنت کا ذکر ہے، کے متعلق حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت سن لیں، شاید کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلہ میں آج کی غفلت دور ہو سکے — بنی اسرائیل گناہوں میں ملوث ہوئے۔ تو ان کے علماء نے روکا تو سہی لیکن لوگ باز نہ آئے تو علماء نے ان کے ساتھ ہی اکل و شرب اور نشست و برخاست شروع کر دی نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں مجرموں کے قلوب کی ظلمت کا اثر ان پر بھی پڑا اور یہی وہ مقام ہے جہاں آکر انسان لعنت خداوندی کا شکار ہوتا ہے — گویا علماء کا فرض ہے کہ وہ اپنا کام کرتے رہیں، لوگ نہیں مانتے تو نہ مانیں، اس کے سبب فرض سے اعراض و غفلت ستم بالائے ستم اور شدید قسم کی نافرمانی ہے بہر طور جماعت صحابہ کے ایک عظیم المرتبت فرد، قرآن کے خادم اور تفسیر قرآن پر سب سے بڑی اتھارٹی کا مختصر تذکرہ اور ان کے تفسیری ارشادات کا نمونہ اس لئے پیش کیا گیا کہ خلق خدا کو صحابہ کرامؓ کے تعلق باللہ۔ تعلق مع القرآن اور رسول اکرم کے ارشادات کو محفوظ رکھنے کے متعلق اندازہ ہو سکے کہ اس معاملہ میں ان کے ذوق و جذبات کا کیا عالم تھا؟ — قرآن اور صاحبِ قرآن سے اس قسم کی عقیدت و وارفتگی آج کے مسائل کا حل ہے ورنہ ع نیست ممکن جز بقرآں زیستن۔

oooooooooo

قرآنی علوم و فہم کا درجہ حکمت

قسط ۱۳

مولانا محمد تقی امینی

سماج کی آسمانی مدد و رہنمائی کا سلسلہ اس وقت ختم کر دیا گیا جب کہ طبعی قوتوں اور صلاحیتوں میں خود نگہی و خود اعتمادی کا وہ درجہ نمودار ہو گیا کہ ایک کامل و جامع مدد و رہنمائی کے ذریعہ ان قوتوں اور صلاحیتوں کی ضابطہ بندی کی جا سکے اور پھر خود غور و فکر کر کے اہم معاملات میں کسی نتیجہ و فیصلہ پر پہنچنے میں تردد نہ ہو۔

غالباً اسی درجہ کی طرف قرآن حکیم کی ان آیتوں میں اشارہ ہے۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ الخ [1]

"آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تمہارے لیے اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کیا۔"

وَتَمَّتْ کَلِمَةُ رَبِّکَ صِدْقًا وَّعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِهٖ [2]

"آپ کے رب کی سچائی اور انصاف کی باتیں کامل ہو گئیں۔ اس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں ہے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

فضلت علی الانبیاء بست اعطیت جوامع الکلم [3]

"میں نبیوں پر چھ چیزوں پر فضیلت دیا گیا ہوں ان میں ایک یہ کہ جوامع الکلم مجھے عطا ہوا ہے۔"

---

[1] المائدہ آیت ۳ [2] الانعام، آیت ۱۱۵

[3] مسلم ج ۱ کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ۔

دوسری روایت میں ہے :

بعثت بجوامع الکلم [1] — میں جوامع الکلم کے ساتھ بھیجا گیا ہوں۔

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضؓ سے روایت ہے۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علّم فواتح الخیر وخواتمہ [2] — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو امورِ خیر کے فواتح (سرچشمے) اور امورِ خیر کے "جوامع" کی تعلیم دی گئی۔

"جوامع الکلم" سے مراد آسان و مختصر الفاظ میں کثیر معانی پائے جائیں [3] چنانچہ ابن قیمؒ کہتے ہیں :

جوامع الکلم ھی الالفاظ الکلیۃ العامۃ المتناولۃ لافرادھا [4] — جوامع الکلم وہ عام کلی الفاظ ہیں جو اپنے تمام افراد کو شامل ہوں۔

اس درجہ میں آسمانی مدد و رہنمائی کا جاری رہنا اور اس میں ردّ و بدل کرتے رہنا دونوں سخت مضر تھے کہ ان میں سے خود نگہی و خود اعتمادی کو ٹھیس پہنچتی اور سماجی تعمیر و ترقی کی وہ محنی صلاحیتیں بروئے کار نہ آتیں جن کے لیے سلسلہ ختم ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ کامل و جامع مدد و رہنمائی سے پہلے قوتوں اور صلاحیتوں میں کمی کی طرف اشارہ ان واقعات میں ہے۔

(۱) مصر سے نکلنے کے بعد حضرت موسےٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو فلسطین میں آباد ہونے کا حکم دیا اور ہر طرح اللہ کی مدد کا یقین دلایا۔ لیکن اس کے جواب میں بنی اسرائیل نے کہا۔

یٰمُوْسٰٓی اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِیْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ [5] — اے موسیٰ! ہم اس میں ہرگز داخل نہ ہوں گے جب تک کہ وہ (باشندے) اس میں موجود ہیں۔ آپؑ اور آپؑ کے رب دونوں جا کر ان سے لڑیے ہم یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔

---

[1] مسلم ج ۱ کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ [2] نووی شرح مسلم حوالہ بالا۔
[3] مسند احمد بن حنبل ج ۱ ص ۳۹۱ عن عبداللہ بن مسعود [4] اعلام الموقعین ج ۱ تفسیر جوامع الکلم
[5] المائدہ آیت ۲۴۔

اہلِ نظر سے مخفی نہیں ہے کہ اس جواب میں جس طرح زوال زدگی کا اثر موجود ہے اسی طرح خود نگہی و خود اعتمادی میں کمی کا بزبانِ حال اعتراف موجود ہے۔ چنانچہ اسی واقعہ میں ہے کہ حضرت موسےٰ علیہ السلام نے فرمایا۔

یٰقَوْمِ ادْخُلُوا الخ [1]

" اے میری قوم اس مقدس سرزمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے اور پیٹھ پیچھے نہ پھرو ورنہ نامرادوں میں سے ہو کر رہ جاؤ گے تو انہوں نے کہا کہ اس میں تو بڑے زور آور لوگ ہیں۔ ہم اس میں اس وقت تک نہ داخل ہوں گے جب تک وہ وہاں سے نہ نکل جائیں"

(۲) قتل کے ایک خاص واقعہ میں قاتل کا سراغ لگانے کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے گائے ذبح کی اور اس کے خون و گوشت کے پاس جمع ہو کر سربرآوردہ لوگوں کو قسم کھانے کا حکم دیا۔ یہ قسامہ کی ایک شکل تھی۔ اس حکم کی تعمیل میں بنی اسرائیل نے گائے سے متعلق جس قسم کے سوالات کیے تھے، [2] مثلاً اس کا کیا رنگ ہو۔ اس کی عمر کیا ہو، جوان ہو یا بوڑھی ہو، زمین جوتنے یا سیراب کرنے کا کام لیا گیا ہو یا نہ لیا گیا ہو وغیرہ۔ ان سے جس طرح فسادِ مزاج کا ثبوت ملتا ہے، اسی طرح خود نگہی و خود اعتمادی میں کمی کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے سوال کرتے کرتے یہ بھی کہا تھا۔

اِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا وَ — بلاشبہ گائے ہمارے اوپر مشتبہ ہو گئی ہے
اِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ [3] — اگر اللہ نے چاہا تو ہم راہ یاب ہوں گے۔

بار بار سوالات کرنے اور جواب پانے کے باوجود فیصلہ نہ کر سکنا بجائے خود قوتوں اور صلاحیتوں میں اس کمی پر دلالت کرتا ہے جو کسی نتیجہ تک پہنچنے میں رکاوٹ بنتی ہے۔

کامل و جامع مدد و رہنمائی کے وقت قوتوں اور صلاحیتوں میں خود نگہی و

---

[1] المائدہ آیت ۲۱-۲۲ [2] البقرہ آیت ۶۷ تا ۷۲
[3] البقرہ آیت ۷۰ -

خود اعتمادی پیدا ہونے کی طرف اشارہ ان واقعات میں ہے۔

(۱) جنگ احد میں زخم کھانے اور نقصان اٹھانے کے باوجود جب دشمنوں سے ڈرانے کی کوشش ہوئی اور دوبارہ حملہ آور ہونے کی خبر پھیلائی گئی تو اس خبر سے ڈرنے کے بجائے اور مضبوطی پیدا ہوئی۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے:

اَلَّذِیْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ	جن سے لوگوں نے کہا کہ دشمن نے تمہارے
اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ	لیے بڑی طاقت اکٹھی کی ہے اس سے
فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ	ڈرو تو اس بات نے ان کے ایمان میں
اِیْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا	اور اضافہ کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ اللہ
اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِیْلُ۔[1]	ہمیں کافی ہے اور وہی بہترین مددگار ہے"

(۲) اسی جنگ احد میں جب سورتِ حال دگرگوں ہوگئی اور دشمنوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر پھیلا کر لوگوں کو گمراہ کرنا چاہا تو یہ آیت نازل ہوئی:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ	محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو ایک رسول ہیں۔ ان
خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ	سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں تو اگر وہ
اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ	وفات پا گئے یا قتل کر دیے گئے تو تم
انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓی اَعْقَابِكُمْ وَ	پلٹ پیچھے پھر جاؤ گے۔"
مَنْ یَّنْقَلِبْ عَلٰی عَقِبَیْهِ	
فَلَنْ یَّضُرَّ اللّٰهَ شَیْئًا[2]	

آیت میں یہ تاثر دینے کی کوشش ہے کہ تم لوگ قوتوں اور صلاحیتوں کے ایک ایسے درجہ پر فائز ہو کر اگر بالفرض اللہ کے رسول نہ بھی رہے تو بھی تم اس کام کو سنبھال لو گے۔ چنانچہ اس کی تائید حضرت ابوبکرؓ کی سب سے پہلی تقریر سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد مسجد نبویؐ میں کی تھی جس کے الفاظ یہ ہیں:

اَلَا مَنْ كَانَ یَعْبُدُ مُحَمَّدًا	غور سے سن لو جو شخص محمد صلی
فان محمدا قد مات	اللہ علیہ وسلم کی پرستش کرتا تھا تو

---

[1] آل عمران آیت ۱۷۳ [2] آل عمران آیت ۱۴۴

ومن كان يعبد الله فانه حيّ لا يموت۔

ان کا وصال ہو گیا اور جو شخص اللہ کی عبادت کرتا تھا تو بے شک اللہ زندہ ہے۔ اس کے لیے کبھی موت نہیں۔

اس موقع پر حضرت ابوبکرؓ نے مذکورہ آیت وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ کو بھی بطور دلیل پیش کیا تھا اور وہی تاثر دینے کی کوشش کی تھی جو اوپر مذکور ہو چکا قوتوں اور صلاحیتوں کا مذکورہ درجہ نمودار ہونے کے بعد آسمانی مدد و رہنمائی جاری رہنے کی ضرورت اگرچہ باقی نہ رہی لیکن اس کی جامعیت و کاملیت کو عملاً برقرار رکھنے کے لیے اس کی تعبیر و تشریح اور اخذ و استنباط کا سلسلہ جاری رہنا ضروری قرار پایا۔ تاکہ ہر دور و زمانہ میں اس کا رشتہ نمو پذیر زندگی اور ترقی پذیر سماج سے منقطع نہ ہونے پائے۔

ظاہر ہے کہ ہر دور کی زندگی اور ہر زمانہ کا سماج انھیں قوتوں اور صلاحیتوں سے وجود میں آئے گا جن کی ضابطہ بندی قوتوں اور صلاحیتوں میں مطلوبہ درجہ نمودار ہونے کے بعد کی گئی ہے۔ اس بنا پر زندگی و سماج کی ترقی سے جس قدر نئی جزئیات پیدا ہوں گی ضرورت نئی تعبیر و تشریح اور ان سے اخذ و استنباط کی ہے اگر یہ کام نہ کیا جاتا رہا تو آسمانی مدد و رہنمائی کی جامعیت و کاملیت پر حرف آئے گا۔ پھر وہ ایک دور و زمانہ کے ساتھ محدود ہو کر رہ جائے گی۔ حالانکہ اس کی حفاظت بقاء کار رہتی دنیا تک کے لیے انتظام کیا گیا ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ [1]

"ہم نے ہی اس کو (قرآن) اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں"

دوسری جگہ ہے:

لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ [2]

باطل کا دخل نہ اس کے آگے سے ہے۔ اور نہ اس کے پیچھے سے۔ یہ حکمت والے اور قابل تعریف کا اتارا ہوا ہے۔

---

[1] الحجر، آیت ۹ ۔ [2] حٰمٓ السجدہ آیت ۴۲

اس کام کے لیے میکانکی صلاحیتیں ناکافی سمجھی جاتی ہیں کہ ان سے کسی جدید تحقیق، جدید تعبیر اور جدید اسلوب کی نمائندگی کرنے کی توقع بے سود ہے بلکہ اس کے لیے تحقیقی صلاحیتیں درکار ہیں جو نئی تعبیر و تشریح اور اخذ و استنباط کے ذریعہ ماضی اور حال کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتی اور بہتر مستقبل کے لیے خطوط کی نشاندہی کرتی ہیں۔

اس کام کے لیے سب سے پہلے مخاطب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے جیسا کہ اس آیت میں ہے:

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ [1]	اے نبیؐ ہم نے آپ کی طرف حق کے ساتھ کتاب اتاری تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے آپ کو دکھایا۔

ظاہر ہے کہ رؤیت سے مراد یہاں بصری رؤیت نہیں بلکہ قلبی رؤیت ہے۔ جس کی اللہ کی طرف نسبت ہے اور یہ خصوصیت صرف شعورِ نبوت کو حاصل ہے جو تخلیقی صلاحیت سے بھی بڑھ کر ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تمام وہ لوگ مخاطب ہیں جو اخذ و استنباط کی صلاحیت رکھتے ہیں جیسا کہ ذیل کی آیت میں "لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ" کے ذریعے ایسے تمام لوگوں کو غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ [2]	ہم نے آپؐ پر الذکر (قرآن) اتارا۔ تاکہ جو چیز لوگوں کی طرف بھیجی گئی ہے، آپؐ ان کے سامنے بیان کردیں تاکہ وہ غور و فکر کریں۔

غور و فکر اخذ و استنباط کی صلاحیت کا ثبوت اس آیت میں ہے جس سے تخلیقی صلاحیت کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے۔

---

[1] النساء آیت ۱۰۵ [2] النحل آیت ۴۴

وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ [1]

اگر اس کو اللہ کے رسول اور اہل علم تک پہنچا دیتے تو ان میں سے جو استنباط کرنے والے ہیں وہ اس کو سمجھ جاتے۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جن لوگوں کو علمی حیثیت سے مقام شہادت پر کھڑا کیا جاتا ہے ان کے لیے تعبیر و تشریح اور اخذ و استنباط کی صلاحیت کے بغیر چارہ نہیں رہتا کہ وہ اس کے بغیر نہ انبیاء کے وارث ہونے کے لائق ہوتے اور نہ مقام شہادت کے شرف سے متصف قرار پاتے ہیں۔

قرآن حکیم میں ہے:

لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ۔ [2]

تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ ہو۔

دوسری جگہ ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا [3]

اسی طرح ہم نے تم کو معتدل امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔

شہادت جس طرح قول و عمل سے ہوتی ہے فہم و ادراک سے بھی ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مقام شہادت بجائے خود اس بات کا ثبوت ہے کہ نبوت اگرچہ ختم ہوگئی لیکن کار نبوت ہمیشہ باقی رہے گا اور ہر دور و زمانہ میں تعبیر و تشریح اور اخذ و استنباط کی وہ نوع وجود میں آنی ضروری ہوگی کہ اس کے ذریعے نمو پذیر زندگی اور ترقی پذیر سماج کا نہ صرف رشتہ آسمانی مدد و رہنمائی کے ساتھ برقرار رہے بلکہ خود مدد و رہنمائی زندگی و توانائی سے بھرپور نظر آئے۔ اور یہ کام قرآنی علم و حکمت میں درجۂ حکمت پر فائز ہوئے بغیر نہیں انجام پا سکتے (باقی آئندہ)

---

[1] النساء آیت ۸۳ [2] الحج آیت ۷۸

مولانا محمد طاسین

مضاربت کی حقیقت اور شرعی حیثیت

قسط (۴)

اس میں شک نہیں کہ اسلام سے پہلے عرب معاشرے میں قرض و مضاربت کا معاملہ عام طور پر رائج چلا آرہا تھا لیکن اسلام کے بعد خصوصاً تحریم ربٰو کے اعلان کے بعد اس کا رواج تقریباً ختم ہوگیا۔ زرقانی شرح مؤطا کی عبارت میں آپ نے پڑھا کہ بعض علماء کے نزدیک اسلام میں مضاربت کا پہلا معاملہ وہ تھا جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور ان کے صاحب زادوں کے درمیان طے پایا، اور بعض کے نزدیک پہلا معاملہ وہ تھا جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور یعقوب مولیٰ الحرقہ کے مابین طے پایا، اس کا صاف مطلب یہ کہ اسلام میں معاملے کی اہمیت تقریباً ختم ہوگئی اور اس کو تھرڈ کلاس قسم کا معاملہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا۔ بعض ضعیف روایات میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی مضاربت کا جو ذکر ہے اس کی کوئی خاص اہمیت اس وجہ سے بھی نہیں کہ حضرت عباسؓ تحریم ربٰو کے اعلان تک جو سن نو ہجری میں ہوا ربٰو کا لین دین بھی کراتے رہے تاآنکہ خطبہ حجۃ الوداع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ختم کرنے کا اعلان فرمایا اور ظاہر ہے کہ ربٰو کے مقابلہ میں مضاربت کئی وجوہ سے بہتر معاملہ ہے۔ لہٰذا اگر حضرت عباسؓ ربٰو کے معاملہ کے ساتھ ساتھ قرض و مضاربت پر بھی مال دیتے اور کام کراتے رہے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔

بہرحال جو علماء حضرات جوازِ مضاربت کے لئے یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ یہ معاملہ پہلے سے رائج چلا آرہا ہے اسلام نے اس سے روکا نہیں بلکہ اسے قائم و جاری رکھا اور یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بعض صحابہؓ جیسے حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے مضاربت کا معاملہ کیا اور آپؐ نے ان کو منع نہیں فرمایا اور اگر یہ جائز نہ ہوتا تو آپ ضرور منع فرماتے گویا اس کا جواز حدیث تقریری سے ثابت ہے۔ ان حضرات کی یہ دلیل صرف اس وقت قابلِ اعتماد اور لائق استدلال ہوسکتی ہے جب وہ صحیح روایات سے متعدد ایسی مثالیں پیش کریں جن

۔۔۔ یہ نہ ہو کہ متعدد صحابہ کرام نے متعدد اوقات میں مضاربت کے معاملے کئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں آئے لیکن آپ نے ان کو منع نہیں فرمایا اور خاموشی کے ساتھ برقرار رکھا اور یہ کہ ایسا تحریم ربٰو کے اعلان کے بعد ہوا۔ کیونکہ اس کے بغیر یہ دعوٰی ثابت نہیں ہو سکتا کہ اسلام نے اس معاملے کو حسبِ سابق جاری اور قائم رکھا، رہی حضرت عباسؓ والی روایت تو جیسا کہ پیچھے عرض کیا گیا یہ روایت محدثین کے نزدیک ضعیف و ناقابلِ اعتبار ہے۔ نیز اس میں یہ احتمال بھی موجود ہے کہ یہ تحریم ربٰو سے پہلے کی ہو۔

اسی طرح جوازِ مضاربت کے متعلق یہ دعوٰی کہ صحابہ کرام کا اس پر اجماع ہوا بے دلیل دعوٰی ہے، دو تین صحابہ کرام کا یتیموں کی مصلحت کی خاطر یتیموں کے مال کو مضاربت پر دینا، زیادہ سے زیادہ یہ ثابت کرتا ہے کہ یتیموں کی حد تک یہ معاملہ جائز ہو سکتا ہے۔ جو خود کام کرنے اور کمانے سے معذور ہوتے ہیں، اور پھر اس کو اجماعِ صحابہ کا نام دینا زبردستی کی بات ہے۔

یہاں میں علامہ ابن حزم کی اس عبارت کو نقل کرنا اور اس پر بحث کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو ان کی کتاب مراتب الاجماع میں ہے اور متعدد علماء نے اپنی کتابوں میں اس کو نقل کیا ہے میرے پاس چونکہ اصل کتاب مراتب الاجماع موجود ہے لہٰذا میں براہ راست اصل کتاب کی عبارت نقل کرتا ہوں۔ وہ عبارت اس طرح ہے:

کل ابواب الفقه لیس منها باب اِلّا وله اصل فی القرآن والسنة نعلمه ولله الحمد حاشا القراض فما وجدنا له اصلاً فیهما البتة ولکنه اجماع صحیح مجرد، والذی نقطع علیه انه کان فی عصر النبی صلّی الله علیه وسلم وعلمه فاقره، لولا ذٰلك ماجاز۔

ترجمہ: فقہ کے تمام ابواب میں کوئی باب ایسا نہیں مگر اس کی اصل اور دلیل قرآن و سنّت میں موجود ہے جسے بحمد اللہ ہم جانتے ہیں سوائے قراض و مضاربت کے کہ ہمیں اس کے لئے قرآن و سنّت میں قطعاً کوئی اصل اور دلیل نہیں ملی لیکن اس کی اصل صرف اجماعِ مجرّد ہے یعنی جس کی کتاب و سنّت میں کوئی سند نہیں، اور جو بات قراض کے متعلق ہم قطعیت کے ساتھ کہہ سکتے ہیں وہ یہ کہ قراض عہدِ رسالت میں تھا رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جاننے کے باوجود اس سے منع نہیں کیا اور برقرار رہنے دیا، اور اگر یہ [illegible] تو جائز نہ ہوتا۔

علامہ ابن حزم نے اس عبارت میں قطعیت اور یقین کے ساتھ یہ دعویٰ کیا ہے کہ قرآن اور سنت میں قراض و مضاربت کے جواز کے لئے کوئی اصل اور کوئی سند نہیں، پھر یہ فرمایا ہے کہ مضاربت کے جواز کی بنیاد اور دلیل اجماع ہے اور اجماع بھی وہ جس کی کتاب و سنت میں کوئی سند نہیں یعنی اجماعِ مجرّد، تیسری بات یہ فرمائی کہ چونکہ قراض و مضاربت کا معاملہ عہدِ نبوّت میں رائج تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم بھی تھا لیکن آپؐ نے اس سے منع نہیں فرمایا۔ لہٰذا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ معاملہ ناجائز نہیں اگر ہوتا تو آپؐ اس سے ضرور منع فرماتے۔

علامہ ابن حزم کی اس عبارت پر میں اپنے خیالات پیش کرنے سے پہلے مناسب سمجھتا ہوں کہ وہ اعتراضات نقل کردوں جو کتاب مراتب الاجماع کو شائع کرنے والے ایک مصری عالم نے اس عبارت پر فٹ نوٹ میں لکھے ہیں، اس عبارت پر ان کا پہلا اعتراض یہ کہ ابن حزم جس مسلکِ ظاہری سے تعلق رکھتے ہیں اس کی رُو سے صرف وہی اجماع صحیح اور قابلِ اعتبار ہے جس کی سند کتاب و سنت میں موجود ہو اور چونکہ خود ان کے بقول کتاب و سنت میں قراض و مضاربت کے لئے کوئی سند اور اصل موجود نہیں۔ لہٰذا ان کے مذہب ظاہری کی رُو سے یہ اجماع صحیح نہیں، دوسرا اعتراض یہ کہ علامہ ابن حزم کے نزدیک تحقق اجماع کے لئے کسی کی مخالفت کا علم نہ ہونا کافی نہیں بلکہ یہ علم ہونا ضروری ہے کہ کسی نے مخالفت نہیں کی۔ حالانکہ قراض کے متعلق وہ جس اجماع کے قائل ہیں وہ کسی کی مخالفت کا علم نہ ہونے پر ہے۔ اس علم پر نہیں کہ کسی نے اس کی مخالفت نہیں کی، تیسرا اعتراض یہ کہ ابن حزم ایک طرف تو تسلیم کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قراض پر تعامل تھا۔ اور آپؐ کو اس کا علم بھی تھا لیکن آپؐ نے اس سے منع نہیں فرمایا جس کا مطلب یہ کہ قراض کے جواز کے لئے اگر قولی اور فعلی سنت موجود نہیں تو تقریری سنت ضرور موجود ہے جو بجائے خود ایک اصل اور سند ہے، اور دوسری طرف وہ یہ فرماتے ہیں کہ کتاب اور سنت میں قراض کے لئے کوئی اصل نہیں کھلا ہوا تضاد ہے، چوتھا اعتراض یہ کہ علامہ ابن حزم کا جس مسلکِ ظاہری سے تعلق ہے اس کا دعویٰ ہے کہ ہر جزوی مسئلہ کے لئے کتاب و سنت میں نص کا موجود ہونا ضروری ہے تو پھر ابن حزم مسئلہ قراض کے متعلق نص کے وجود کا کیسے انکار کرتے ہیں! پانچواں اعتراض یہ کہ قرآن مجید کی آیت اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ

سے قراض کا جواز بھی نکلتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کیسے درست ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید میں اس کی کوئی اصل نہیں، چھٹا اعتراض یہ کہ جن چند روایات کے پیش نظر ابن حزم عہدِ رسالت میں مضاربت وقراض کے وجود کے قطعیت کے ساتھ قائل ہیں وہ روایات محدثین کے نزدیک ضعیف ہیں جن سے زیادہ سے زیادہ علم ظنی تو حاصل ہو سکتا ہے لیکن علم قطعی و یقینی حاصل نہیں ہوتا۔ لہٰذا مذکورہ عبارت میں نقطع علیہ کا لفظ غیر مناسب ہے۔

جہاں تک میری طالب علمانہ تحقیق و جستجو کا تعلق ہے پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر علامہ ابن حزم اور علامہ ابو عبد الملک کی مراد یہ ہے کہ قرآن اور سنت میں قراض کے لئے کوئی واضح اور جزوی صراحت کے ساتھ کوئی آیت یا حدیث موجود نہیں جس میں قراض کے اختیار کرنے نہ کرنے کا ذکر ہو تو یہ درست ہے، اور اگر مراد یہ ہے کہ قرآن و حدیث میں کوئی ایسا مبدأ عام اور تصورِ کلی بھی موجود نہیں جس سے مضاربت کا جواز مستنبط ہوتا ہو تو یہ درست نہیں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ قرآن مجید میں ایک ایسا اصل کلی ضرور موجود ہے جس میں دوسرے معاشی معاملات کی طرح قراض و مضاربت کے لئے بھی اجمالی روشنی و راہنمائی موجود ہے اور جس سے مضاربت کی شرعی حیثیت کا بخوبی تعین ہو سکتا ہے، ایسا اصل کلی یا اصولی تصور قرآن مجید کی جس آیت سے نکلتا اور مستنبط ہوتا ہے وہ سورۃ البقرہ کی یہ آیت ہے:

وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۔

اور اللہ نے معاملۂ بیع کو حلال اور معاملۂ ربٰو کو حرام ٹھہرایا

اس آیت میں بظاہر تو دو جزوی اور خاص معاشی معاملات کے متعلق دو جزوی حکم ہیں یعنی معاملۂ بیع حلال و جائز اور معاملۂ ربٰو حرام و ناجائز ہے لیکن دراصل اس میں جملہ معاشی معاملات کے جواز و عدم جواز سے متعلق ایک اصولی تصور اور کلی ضابطہ بیان ہوا ہے جس کی روشنی میں یہ سمجھا اور معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اپنی حقیقت و ماہیت کے لحاظ سے کونسا معاشی معاملہ ہر پہلو سے قطعی حرام اور ناجائز معاملہ ہے اور کونسا قطعی حلال اور جائز معاملہ اور کون سا بعض پہلوؤں سے حلال و جائز اور بعض پہلوؤں سے حرام و ناجائز یعنی بین بین اور مشتبہ معاملہ ہے۔ گویا اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ جو معاشی معاملات اپنی حقیقت و ماہیت، اپنی وضع و ساخت اور اپنے اثرات و نتائج کے لحاظ سے معاملہ بیع و تجارت کی طرح ہیں۔ وہ قطعی طور پر حلال و جائز، اور جو معاملۂ ربٰو

کی طرح ہیں وہ قطعی طور پر حرام ٹھہرایا گیا" اور جو ایک پہلو سے بیع کی طرح اور دوسرے پہلو سے ربٰو کی طرح ہیں وہ مشتبہ و مکروہ ہیں۔

معاملۂ بیع کی حقیقت و ماہیت جس کو ہر کاروباری آدمی جانتا اور بادنیٰ غور و فکر جان سکتا ہے صرف یہ کہ اس میں ایک تاجر اپنے سرمائے کے ساتھ دماغی و جسمانی محنت و مشقت کے ذریعے خرید و فروخت کا کام کرتا اور نفع کماتا ہے، دماغی محنت اس کی وہ ہوتی ہے جو وہ مال خریدنے اور بیچنے سے پہلے سوچتا اور غور و فکر کرتا ہے کہ اس کو کیا مال کب اور کہاں سے خریدنا اور کب اور کہاں بیچنا چاہیے وغیرہ" اور جسمانی محنت اس کی وہ دوڑ دھوپ اور جد و جہد ہوتی ہے جو وہ مال خریدتے، ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے اور حفاظت کرنے میں برداشت کرتا ہے" اور چونکہ انسانی محنت و مشقت پیدائش مال و دولت کا ایک ایسا عامل اور ذریعہ ہے جس پر سب کا اتفاق ہے" ہر معاشی نظام سے تعلق رکھنے والے خواہ اشتراکی ہوں یا سرمایہ دار انسانی محنت کو پیدائش دولت کا ذریعہ تسلیم کرتے ہیں۔ لہٰذا معاملۂ بیع میں ایک تاجر کو اپنے اصل سرمائے پر جو مزید مال حاصل ہوتا ہے وہ اس محنت و مشقت کا عوض اور ثمرہ ہوتا ہے جو تاجر کو بذات خود اٹھانی پڑتی ہے۔ لہٰذا اس کے جواز میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں بشرطیکہ تاجر نے اس میں کسی دھوکے اور جھوٹ سے کام نہ لیا ہو۔ جو معاملۂ بیع و تجارت کی ماہیت میں داخل نہیں بلکہ ایک خارجی اور عارضی چیز ہے۔ بنا بریں ہر وہ معاشی معاملہ معاملۂ بیع کی تعریف میں آتا اور حکم جواز میں اس کا مماثل قرار پاتا ہے جس میں ہر فریق اپنی دماغی جسمانی محنت و مشقت کی بناء پر ربح و نفع کا مستحق ٹھہرتا ہے۔

معاملۂ ربٰو کی حقیقت و ماہیت جو عام طور پر متعارف اور جانی پہچانی ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس میں ایک فریق اپنا مال دوسرے کو بطور قرض دیتا ہے اور یہ طے کرتا ہے کہ مقررہ میعاد کے بعد مقروض قرض کا اصل مال مع اضافہ کے ادا کرے گا اور اس میں اس اضافہ کے عوض قرض دینے والے کی طرف سے نہ کوئی پیدا آور محنت و مشقت موجود ہوتی ہے اور نہ کوئی نفع بخش مادی شے۔ لہٰذا وہ دوسرے کی چیز بلا عوض لیتا ہے، بنا بریں ہر وہ معاشی معاملہ معاملۂ ربٰو کے مماثل و مشابہ قرار پاتا ہے جس میں ایک فریق اپنے مال کے تحفظ کی ضمانت کے ساتھ ساتھ بغیر کسی پیدا آور محنت و مشقت کے کسی مزید مال کا حق دار ٹھہرتا ہے خواہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

اب جب ہم اس مذکورہ اصولی ضابطے اور کلی تصور کی روشنی میں معاملۂ قراض و مضاربت
جائزہ لیتے ہیں تو یہ معاملہ بعض پہلوؤں سے معاملۂ بیع کے مشابہ اور بعض پہلوؤں سے
املۂ ربٰو کے مماثل نظر آتا ہے۔ مثلاً اس پہلو سے معاملۂ بیع کے مشابہ نظر آتا ہے کہ اس میں
ل مضارب خرید و فروخت کا عمل کرتا ہے اور اپنی دماغی جسمانی محنت و کاوش کے عوض
ع کے ایک حصہ کا مستحق بنتا ہے۔ نیز اس پہلو سے بھی کہ اس میں بصورت خسارہ و نقصان،
ی والا فریق پورے کا پورا نقصان و خسارہ خود برداشت کرتا ہے جس طرح کہ اپنے مال
ے ساتھ خود تجارت کرنے کی صورت میں نقصان ہو جائے تو تاجر کو خود برداشت کرنا پڑتا ہے،
یا بصورت نقصان، نقصان برداشت کرنے کے لحاظ سے رب المال یعنی سرمائے والا فریق بھی
ارت میں شریک ہوتا گو عمل کے لحاظ سے شریک نہیں ہوتا۔ اور جس پہلو سے معاملۂ مضاربت،
املۂ ربٰو کے مشابہ نظر آتا ہے وہ یہ کہ نفع کی صورت میں رب المال کو اپنے اصل سرمائے پر
زائد مال ملتا ہے اس کے عوض اس کی طرف سے کوئی پیداآور دماغی و جسمانی محنت و مشقت
جود نہیں ہوتی جو اسے زائد مال کا حق دار ٹھہراتی ہو۔ جہاں تک نقصان کے خطرے و اندیشے
تعلق ہے جو نقصان کی صورت میں بعض دفعہ رب المال کو برداشت کرنا پڑتا ہے تو وہ حقیقت
ں کوئی ایسی چیز نہیں جس کو صحیح معنوں میں مال کا بدل قرار دیا جاسکتا ہو اور اگر ایسا ہوتا تو
ہر میسر و قمار یعنی جوئے کو ضرور جائز ہونا چاہیے تھا کیونکہ اس میں ہارنے اور نقصان اٹھانے
خطرہ و اندیشہ، قراض و مضاربت کے مقابلہ میں کہیں زیادہ موجود ہوتا ہے، اسی طرح رسک
ر خطرے کو اگر زائد مال کے جواز کی بنیاد تسلیم کر لیا جائے تو پھر ربٰو کو بھی عقلی طور پر حرام ثابت کرنا
شکل ہو جاتا ہے۔ بہرحال قراض اور قمار میں ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ قراض میں رب المال نقصان
خوشی کے ساتھ برداشت کرتا اور میسر و قمار میں ہارنے والا نقصان کو بادل نخواستہ اور ناخوشی
ے ساتھ برداشت کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ بعض دفعہ جوئے بازوں کے درمیان خونریز لڑائی
جھگڑے کی شکل ظہور میں آتی ہے۔

اسی طرح عملی اثرات و نتائج کے لحاظ سے دیکھا جائے تو بعض اثرات و نتائج کے اعتبار
ے معاملۂ مضاربت، معاملۂ بیع و تجارت سے اور دوسرے بعض اثرات و نتائج کے لحاظ سے
عاملۂ ربٰو کے مماثل نظر آتا ہے۔ مثلاً اس میں بھی خرید و فروخت کے ذریعے اشیاءِ ضرورت
تبادلہ ہوتا اور لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ لہٰذا اس پہلو سے یہ معاملہ بیع و تجارت کی

کی طرح ہے، اور چونکہ اس میں بھی بعض متمول افراد کو بغیر کسی دماغی جسمانی محنت و مشقت کے راحت و آرام کے ساتھ غیر فطری طریقہ سے مال ملتا ہے اور ان کے تمول میں اضافہ ہوتا ہے لہٰذا ان کے اندر اسی قسم کی معاشرتی برائیاں رونما ہوتی ہیں جیسی کہ سود خور لوگوں کے اندر جنم لیتی اور رائج ہوتی ہیں، احسان و ایثار کا اخلاقی جذبہ مضمحل اور مردہ پڑ جاتا ہے نیز اسراف و تبذیر کی برائی ظہور میں آتی ہے۔

پھر جہاں تک تراضی فریقین کا تعلق ہے جو قرآن و حدیث کی رو سے معاملات کی صحت کے لئے ضروری ہے اور جس کا قرآن مجید کی اس آیت میں واضح بیان ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا	اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو تم آپس
لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ	میں ایک دوسرے کے اموال ناحق طریقہ
بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً	سے نہ کھاؤ مگر یہ کہ تجارت کا طریقہ اور
عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ	باہمی رضامندی سے ہو۔

(النساء)

بلاشبہ یہ تراضی، معاملۂ تراضی و مضاربت کے اندر رب المال اور عامل کے درمیان موجود ہوتی ہے لیکن یہ تراضی اس درجہ کی نہیں ہوتی جس درجہ کی تجارت کے اندر بائع اور مشتری کے درمیان ہوتی ہے، بالفاظِ دیگر مطلب یہ کہ خرید و فروخت کے معاملہ میں فریقین کے مابین عام طور پر جو رضامندی ہوتی ہے وہ ظاہری و باطنی اور کامل ہوتی ہے بخلاف معاملۂ مضاربت کے کہ اس میں رب المال اور عامل کے درمیان جو رضامندی پائی جاتی ہے وہ ظاہری اور ناقص قسم کی ہوتی ہے اس کا ثبوت یہ کہ جس کے پاس حسبِ ضرورت اپنا سرمایہ ہو وہ مضاربت پر دوسرے کے سرمائے کے ساتھ کام نہیں کرتا کیونکہ اپنے سرمائے کے ساتھ تجارت کرنے کی صورت میں اسے پورا نفع ملتا ہے جبکہ دوسرے کے سرمائے کے ساتھ تجارت کرنے کی صورت میں پورے نفع کا ایک حصہ ملتا ہے اور کون ہے جو خوشی کے ساتھ پورے کے مقابلہ میں ادھورے کو پسند اور اختیار کرتا ہے؟ بلکہ ایسے بکثرت واقعات ہیں کہ مضاربت پر کام کرنے والوں کے پاس جب ضرورت کے مطابق اپنا سرمایہ جمع ہو گیا تو انہوں نے مضاربت کو چھوڑ کر اپنے سرمائے کے ساتھ کام کرنا شروع کر دیا، اس کا مطلب سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ مضاربت میں کام کرنے والا فریق پوری خوشی و رضامندی سے کام نہیں کرتا۔

بلکہ اس مجبوری کے تحت کرتا ہے کہ اس کے پاس حسب ضرورت اپنا سرمایہ موجود نہیں ہوتا" اور یہ مجبوری معاملۂ ربٰو کے اندر مضاربت کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہوا کرتی ہے حالانکہ ظاہری طور پر معاملۂ ربٰو کے فریقین کے مابین بھی رضامندی پائی جاتی ہے۔

بہر حال یہ حقیقت ہے جس کا انکار نہیں ہو سکتا کہ معاملۂ مضاربت اپنی بناوٹ و ساخت" اپنی روح و اسپرٹ اور اپنے اثرات و نتائج کے لحاظ سے نہ سو فیصد معاملۂ بیع و تجارت کی طرح ہے اور نہ سو فیصد معاملۂ ربٰو کی طرح، لہٰذا نہ اسے معاملۂ بیع کی طرح طیب حلال کیا جا سکتا ہے اور نہ معاملۂ ربٰو کی طرح قطعی حرام، بلکہ دونوں کے بین بین ایسا معاملہ ہے جو مشتبہات کے زمرہ میں آتا ہے، سنن ابی داؤد وغیرہ میں ایک حدیث نبوی اس طرح ہے:

عن نعمانؓ بن بشیر قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: ان الحلال بیّن وان الحرام بیّن وبینھما امور مشتبھات لا یعلمھا کثیر من الناس، فمن اتقی الشبھات استبرأ دینہ وعرضہ، ومن وقع فی الشبھات وقع فی الحرام۔

ترجمہ: حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ نے روایت کرتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلاشبہ حلال بھی بیّن و واضح ہے اور حرام بھی بیّن و واضح ہے اور دونوں کے درمیان کئی مشتبہ امور ہیں جن کو بہت سے لوگ نہیں جانتے۔ سو یاد رکھو کہ جو مشتبہ امور سے بچا اس نے اپنے دین اور اپنی آبرو کو بچالیا، اور جو مشتبہ امور میں پڑا گویا وہ حرام میں مبتلا ہوا۔

اس حدیث نبوی سے صاف واضح ہوتا ہے کہ کچھ امور و معاملات نمایاں طور پر حلال اور کچھ نمایاں طور پر حرام ہیں چنانچہ بیع و تجارت قطعی و صریح طور پر حلال اور ربٰو قطعی اور صریح طور پر حرام ہے اور کچھ نہ واضح طور پر حلال اور نہ صریح طور پر حرام ہیں کیونکہ ان کے اندر حلت اور حرمت دونوں کی وجوہ پائی جاتی ہیں ایسے امور و معاملات مشتبہ کہلاتے ہیں۔ ایسے مشتبہ معاملات سے احتراز کرنا مسلمان کے دین کے لئے بھی بہتر اور اس کی دنیوی عزت و آبرو کے لئے بھی مفید رہتا ہے۔ اور ایسے مشتبہ معاملات میں پڑنا اور ان کو اختیار کرنا تدریجاً بالآخر حرام میں مبتلا کرتا ہے جو اس کے دین و دنیا کے لئے برا اور مضر ہے مطلب یہ کہ مسلمان کو مشتبہ امور و معاملات سے حتی المقدور بچنے کی کوشش کرنی چاہیے اور یہ کہ ان سے بچنا ان میں پڑنے سے بہتر ہے اس قسم کے مشتبہ امور و معاملات، فقہ کی اصطلاح میں مکروہات کی تعریف میں آتے

یہی اس کا مطلب ہے کہ وہ جائز تو باین معنی ہوتے ہیں کہ حرام نہیں ہوتے لیکن ان کا ترک کرنا، کرنے سے بہتر ہوتا ہے۔ یا بالفاظِ دیگر ان کا ترک کرنا اختیار کرنے سے بہتر ہوتا ہے۔ جیساکہ پیچھے ایک جگہ عرض کیا گیا۔ اصولِ فقہ کی اصطلاح میں جائز کے دو معنے ہیں: ایک جائز بمعنے عدم حرام اور "مالا یعاقب علیہ" یعنی جو حرام نہیں اور جس پر عذاب نہیں اس معنے میں فعل مکروہ بھی آجاتا ہے کیونکہ وہ حرام بھی نہیں اور اس کے کرنے پر عذاب بھی نہیں، اور دوسرا جائز بمعنے "ما یثاب علیہ" یعنی جس کے کرنے پر ثواب ہے۔ اس معنے میں فرض، واجب اور مستحب داخل ہیں۔ گویا بعض امور و معاملات شرعاً جائز تو ہوتے ہیں لیکن کراہیت کے ساتھ جیسے طلاق کہ شرعاً جائز تو ہے لیکن سخت کراہیت کے ساتھ کیونکہ حدیث میں اس کو اَبْغَضُ الْمُبَاحَاتِ فرمایا گیا ہے۔ یعنی مباح لیکن نہایت بُری مباح۔

غرضیکہ معاملہ مضاربت جب نہ تو بیع کی طرح حلال ہے اور نہ ربٰو کی طرح حرام تو قرآن مجید کی آیتِ مذکورہ سے اس کے لئے جو حکم مستنبط ہوتا ہے وہ یہ کہ یہ معاملہ مکروہ یعنی جائز لیکن ناپسندیدہ اور جس کا ترک کرنا کرنے سے بہتر ہے کیونکہ حلال اور حرام کے درمیان جو معاملہ یا چیز ہو اس کی شرعی حیثیت مکروہ ہی کی ہو سکتی ہے۔

میں چونکہ علماء کے اس زمرے سے تعلق رکھتا ہوں جو قرآن مجید کو اصول و مبادی کے لحاظ سے نہایت جامع اور کامل کتابِ زندگی مانتے اور یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں ہر شعبۂ زندگی سے متعلق ایسے تمام اصول کلیہ اور مبادی عامہ موجود ہیں جن کے اندر ہر شعبۂ زندگی کے جملہ جزوی مسائل کے لئے اجمالی ہدایت و روشنی پائی جاتی ہے۔ زندگی کا کوئی معاملہ اور کوئی مسئلہ ایسا نہیں جس کی شرعی حیثیت کا تعین قرآنی اصولوں کی روشنی میں نہ کیا جا سکتا ہو، کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو پھر قرآن حکیم بلحاظ رشد و ہدایت ایک جامع اور مکمل کتاب کیسے ہو سکتا ہے جب کہ یہ ظاہر ہے کہ اس کے اندر تمام جزوی مسائل کے لئے تفصیلی اور الگ الگ جزوی احکام مذکور نہیں، مطلب یہ کہ اس کا جامع اور کامل ہونا" اساسی تصورات اور بنیادی اصولوں کے لحاظ سے ہے لہٰذا میرے نزدیک یہ بات درست نہیں کہ معاملۂ مضاربت کے متعلق کتاب و سنّت کے اندر کوئی اصولی ہدایت بھی موجود نہیں۔ کتاب اللہ کی مذکورہ آیات میں مضاربت کے متعلق جو اجمالی ہدایت ہے وہ میں اوپر عرض کر چکا، اور سنّت کے اندر جو اصولی ہدایت ہے وہ یہ کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ قولاً اس سے منع فرمایا ہے اور نہ عملاً کبھی اس کو اختیار فرمایا ہے، زبانِ مبارک سے منع نہ فرمانا، اس پر دلالت کرتا ہے کہ آپؐ کے نزدیک مضاربت حرام نہیں ورنہ ضرور منع فرماتے، اور عملاً کبھی اس کو اختیار نہ کرنا اور کسی کو کبھی مال مضاربت پر نہ دینا، اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ معاملہ آپؐ کے نزدیک مستحب وپسندیدہ معاملہ نہیں۔ ورنہ آپؐ اس کو کبھی نہ کبھی ضرور اختیار فرماتے، اس حقیقتِ حال سے بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ یہ معاملہ کراہیت کے ساتھ جائز ہے۔ ٹھیک یہی بات قرآن مجید کی مذکورہ آیات سے بھی نکلتی اور مستنبط ہوتی ہے۔ (جاری ہے)

نبی اکرم کی اصل عظمت اور شان کو
کوئی سمجھ نہیں سکتا، حتیٰ کہ کہا جا سکتا ہے کہ
"بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر"
کیا آپ کے دامن سے ... وابستہ ہیں؟
اس اہم موضوع پر
ڈاکٹر اسرار احمد کی مختصر لیکن نہایت مؤثر تالیف
نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے
ہمارے تعلق کی بنیادیں

نبی اکرم کا مقصدِ بعثت
ڈاکٹر اسرار احمد
کی
جامع تصنیف
نبی اکرم کا مقصدِ بعثت
کا مطالعہ کیجیے
مرکزی انجمن خدام القرآن ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

افکار و آراء

جناب ڈاکٹر صاحب - السلام علیکم ورحمۃ اللہ

اُمید ہے آپ معہ اہل وعیال خیریت سے ہوں گے - چند ایک امور کی وضاحت کے لئے عریضہ ہذا ارسال کر رہا ہوں - اُمید ہے بواپسی ڈاک جواب دیکر ثواب دارین حاصل کریں -

پچھلے جمعہ ایک پروفیسر صاحب T.V. پر فلسفۂ شہادت کے سلسلہ میں یہ فرمایا - کہ شہادت دو قسم کی ہے ایک سری - دوسری جہری - اسکے بعد قرآن پاک کی آیت : مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا" جس کی تفسیر یہ فرمائی - کہ ماسوائے شہادت کے حضور اکرمؐ تمام صفات کے حامل تھے - شہادت سے نوازنے کے لئے حضرت حسنؓ کو سری شہادت اور حضرت حسینؓ کو جہری شہادت سے سرفراز کرکے اس صفت سے بھی حضور اکرمؐ کو نوازا گیا - کیونکہ حضرت حسنؓ کا اوپر کا حصہ حضور اکرمؐ کے اوپر کے حصہ اور حضرت حسین کا نیچے کا حصہ حضور اکرمؐ کے نچلے حصہ سے مشابہ تھا - جس کے معنی یہ ہوتے کہ حضرات حسنین نبی اکرمؐ کی شبیہہ تھے - ساتھ ہی ساتھ ایک حدیث بھی بیان فرمائی - کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا - کہ ایک دن جبرئیلؑ سُرخ رنگ کی مٹی لے کر حاضر ہوئے - حضورؐ کے استفسار پر کہنے لگے کہ یہ مٹی کربلا کی ہے - جہاں آپ کے نواسے حسینؓ کی شہادت ہوگی -

مذکورہ بالا قرآنی آیت اور حدیث نبوی جو پروفیسر صاحب نے Refer کی ہیں - ان کا صحیح مطلب اور حدیث کی درستگی کس حد تک ہے ؟ اگر نبی اکرمؐ کو شہادت حسنین کے متعلق پہلے ہی علم تھا ؟ کیا نبی اکرمؐ مرتبہ شہادت سے فیضیاب ہوئے ؟ ان امور کی وضاحت بالتفصیل فرمایئے - کیونکہ ہمارا T.V. ، ریڈیو اور علمائے کرام فلسفۂ شہادت کے متعلق جو جو باتیں کہتے ہیں - اور کفر و اسلام کی جنگ قرار دیتے ہیں - اُنکی روشنی میں جاہل تو جاہل - ایک پڑھا لکھا آدمی بھی بھول بھلیوں میں گھر جاتا ہے - کیونکہ یہ تمام باتیں بڑے بڑے علماء مفتی صاحبان اور پیر حضرات کی زبان مبارک سے منظر عام پر آتی ہیں - اور اُنکی اس بات کو بغیر دلائل کے Refute کرنا ممکن نہیں - قرآن و سنت کی روشنی میں اس آیت مبارکہ اور حدیث شریف کی وضاحت فرما کر ثواب دارین حاصل کریں - تاکہ عوام میں جو بدعات اور غلط عقائد پروان چڑھ گئے اور چڑھ رہے ہیں - اور دن بدن ترقی پر ہیں - اُن کی تصحیح کرانیکی کوشش کی جائے - فقط والسلام

نیازمند و جواب کا طالب مشتاق احمد ۲۵ - بنک روڈ چوہان پارک اسلام پورہ لاہور

جواب:

جناب مشتاق احمد صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ آپ کے سوالات کے جوابات حاضر ہیں:

۱ - اسلام میں شہادت کی کوئی بڑی اور چھوٹی تقسیم نہیں ہے۔ قرآن، حدیث اور اجماع اس تقسیم سے قطعی نا آشنا ہے۔ یہ ایک خود ساختہ تقسیم ہے اور دورِ اوّل جاہلانہ باطنیت ہے۔

۲ - قرآن میں اللہ کو بھی شہید کہا گیا ہے۔ (النساء ۷۹) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی شاہد اور شہید قرار دیا گیا ہے۔ (البقرہ ۱۴۳) مگر اس کا مطلب ہے "گواہ" یا "حق کا گواہ" کسی مسلمان کے راہِ حق میں جان دینے کو قرآن نے کہیں بھی شہید نہیں کہا ہے نہ اُس کی موت کو شہادت سے تعبیر کیا ہے۔ یہ اصطلاحِ فقہ ہے کہ راہِ حق میں مرنے والے کو شہید اور اُس کی موت کو شہادت کہتے ہیں۔ قرآن میں اس کے لئے "قتل فی سبیل اللہ" کے الفاظ ملتے ہیں (اللہ کی راہ میں قتل ہونا) اصطلاحِ فقہ کی رُو سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہید نہیں ہوئے۔ لیکن قرآنی اصطلاح کی رُو سے وہ شاہد اور شہید (حق کے گواہ) ہیں۔ رہی وہ آیت (النساء ۶۹) جس کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے: مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ ۚ تو معلوم ہونا چاہیئے کہ قرآن کے نزدیک یہ کوئی چار مختلف گروہ نہیں ہیں بلکہ کسی ایک شخص میں بھی یہ چاروں صفات جمع ہو سکتے ہیں مثلاً حضرت ابراہیم کو اللہ نے نبی بھی کہا ہے۔ (مریم ۴۱) وہ شہید گواہ بھی ہیں کہ قرآن نے تمام نبیوں کو شہید (گواہ) بھی کہا ہے جس میں آپؐ شامل ہیں (النحل ۸۹) وہ صدیق بھی ہیں (مریم ۴۱) وہ صالح بھی ہیں (البقرہ ۱۳۰)

۳ - حضرات حسینؓ سے مشابہت کی بنا پر اُن کی کسی شہادت (راہِ حق میں جان دینا) کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت قرار دینا سخت ظلم اور جہالت ہے۔ اسلام کا یہ اصول ہرگز نہیں ہو سکتا کہ جان تو کوئی شخص دے اور شہادت کے مرتبے پر کوئی دوسرا فائز ہو جائے۔ یہ محض تخیلاتی چیز ہے۔

۴ - ایسی کوئی صحیح حدیث موجود نہیں ہے جس میں جبرئیلؑ امین کوئی سُرخ رنگ کی مٹی لے کر حضورؐ کے پاس حاضرِ خدمت ہوئے ہوں کہ یہ خاکِ کربلا ہے۔ یہ محض افسانہ طرازی ہے۔

سیرتِ نبوی ﷺ کے ضمن میں ۲ دو عظیم تحفے

ڈاکٹر اسرار احمد

صدر مؤسس، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور و امیر تنظیم اسلامی
کے دروس و تقاریر کے دو مجموعے — اعلیٰ دبیز کاغذ پر خوشنما طباعت کے ساتھ!

رسولِ کامل صلی اللہ علیہ وسلم

یعنی پاکستان ٹی وی سے نشر شدہ ۱۲ تقاریر کا مجموعہ، اور

فرائضِ دینی اور اسوۂ رسول ﷺ

سورۂ احزاب رکوع ۲، ۳ کی روشنی میں

تبلیغی مقاصد کے پیش نظر — ہدیہ صرف چھ روپے فی کتاب — محصول ڈاک علاوہ

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

فون — ۸۵۲۶۱۱

ذیلی دفتر: ۱۱ داؤد منزل - نزد آرام باغ، کراچی ۱ فون برائے رابطہ ۲۱۴۷۰۹

Regd. L. No. 8193

'HIKMAT-E-QURAN' MONTHLY LAHORE

Vol. 3 | FEBRUARY 1985 | No. 12

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاهور

کے قیام کا مقصد

منبع ایمان — اور — سرچشمۂ یقین

قرآن حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے — اور — اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمّتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں تجدیدِ ایمان کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ — اور — غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللهِ